

# خوبو لکھنؤ کاسف

تتریلہ یوسف



# خوشبو اور یقین کا سفر

آنٹریلہ یوسف

نوٹ:-

اس ناول کے جملہ حقوق بنام مصنفہ آنٹریلہ یوسف محفوظ ہیں۔ مصنفہ نے یہ ناول خصوصی طور پر کتاب گھر ( <http://kitaabghar.com> ) کو آن لائن پبلشنگ کی اجازت دی ہے۔ لہذا اس تحریر کی کسی بھی اور آن لائن میگزین، ویب سائٹ، سیل فون ایپ یا انٹرنیٹ پر کسی بھی شکل میں کاپی کرنا خلاف قانون ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی کارروائی کا سامنا اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

## پہلی بات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میرا یہ ناول کتاب گھر کی ایڈمن ہانیہ احمد اور اُن اراکین کے نام جنہوں نے مجھ سے کچھ اچھا..... کچھ نیا لکھے جانے کی خواہش کی۔ میری یہ لکھت اُن تمام مظلومین کے نام جو سمجھوتے کے نام پر جبر و استحصال برداشت کیے جانے پر مجبور ہیں۔ رشتوں میں جب زہر کی آمیزش ہونے لگے تو فریقین کو پل پل اُن کا کیا جبر اور اپنا صبر جتائے جانے سے بہتر کنارہ کر لیا جائے۔ میرے اس لکھے میں یقیناً بہت سی کمیاں رہ گئی ہوں گی۔ اس کے لیے دل سے معذرت خواہ ہوں کہ آخری نہ سہی پہلی غلطی جان کر درگزر کر دیجیے گا کہ ہم سبھی خطا کے پتلے ہیں اور غلطیوں سے سیکھ کر بہتر کرنا سیکھتے ہیں اور معبود حقیقی کو بھی تو اپنے بندوں کی یہی ادا بھاتی ہے کہ خطا کرتا ہے اور سیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور وقت نکال کر اپنی مثبت / منفی رائے ضرور دیجیے گا۔ آپ کی آراء کا احترام کیا جائے گا۔

آنٹزیلہ یوسف

یکم اکتوبر ۲۰۲۲ء



## قسط نمبر 1

سکرین روشن ہوئی تو اس نے فون اٹھا کر دیکھا۔ مطلوبہ میسج تک رسائی کے لیے اسے سپام فولڈر کھولنا پڑا۔ 'آشیانہ مسکن' کے سلسلے میں اکثر اسے معلومات دینے کے لیے ان چاہے پیغامات بھی دیکھنا پڑتے تھے۔ شاید کسی کو رہ نمائی درکار ہو؟ یہ سوچ کر وہ کوئی بھی پیغام ان دیکھنا نہ چھوڑتی۔

”آپ میری کہانی لکھیں گی نا!“ چھ لفظی مان بھرے استحقاق نے اسے جواب ٹائپ کرنے پر اکسایا۔

”فیک آئی ڈی بھی تو ہو سکتی ہے!“ دماغ نے تاویل گھڑی۔

”فیک ہوئی بھی تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟ بات کر لینے میں حرج ہی کیا ہے؟“ دل نے دماغ سے جرح کی۔

☆.....☆.....☆

کمرے کے در و دیوار کی خستہ حالت اس کے مکین کی بے مائیگی کا نوحہ کہہ رہی تھی۔ کمرہ کیا تھا کاٹھ کباڑ سے بھرا سنور روم تھا جس کے ایک کونے میں جگہ بنا کر پرانا پلنگ اور ٹوٹی ہوئی میز رکھی گئی تھی۔ پلنگ اور اس پر بکھرا وجود گواہی دے رہا تھا کہ وقت کے ہر فرعون کو شکست ہو کر ہی رہتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں بالآخر انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں.....

”سوائے لوگو! عبرت حاصل کرو۔“

”اللہ! میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا!“ کمرے کی سیلن زدہ دیواروں سے ٹیڑھے منہ سے کیا گیا

سمجھ میں نہ آنے والا بین ٹکرا کر اسی کے پاس لوٹ آتا کہ دیواروں نے بھی اس کی فریاد پر کان بند کر لیے تھے..... وہ دیواریں جو مظلوم کی آہ پر بھی نہ تڑپیں، وہ عروج کے زوال پر کیوں زبان کھولتیں.....

دائیں ہاتھ سے گھنٹی بجا بجا کر گھر کی واحد مالکن کو پکارتا رہ جاتا جو اپنے نام کے ساتھ ساتھ مزاج کی بھی ملکہ تھی۔ دل کیا تو دل جلانے کی آن میں کمرے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے باتیں سنا جاتی۔ موت کی آہٹ پر کان دھرے مجازی خدا کی خدمت اس پر فرض تو نہ تھی۔

خدا، ہم کو ایسی خدائی نہ دے

کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

ملکہ کی گنگناہٹ اسے صورِ اسرافیل سے کم تو نہ لگتی..... ایسے میں اسے وہ بے اختیار یاد آتی..... اس کے ٹیڑھے لب مسکرانے کی کوشش میں پھیننے کی سعی میں درد ہی دیتے۔ اس کی یاد اب درد کے سوا اور بھلا تھی ہی کیا..... وہ جس کی زندگی میں آہیں بھر دی گئی تھیں۔ ہاں اگر وہ ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن کیا وہ ہوتی یہاں؟ اسے یہاں سے نکل جانے پر اسی نے تو مجبور کیا تھا۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد بھی زندگی کی راہیں مسدود بھی تو اسی نے کی تھیں۔ لیکن کیا وہ رکی؟ نہیں..... وہ تو بہتا پانی تھا۔ لاکھ بندشیں لگاؤ اپنا راستہ بنا ہی لیتا ہے۔ وہ بھی ہر بار نئے سرے سے ہمت مجتمع کیے کھڑی ہو جاتی۔

”کاش وہ مجھے کہیں مل جائے!“ دل سے اک ہوک سی اٹھی اور سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ وہ جو موت کی آہٹ کا منتظر تھا، خوف زدہ ہو گیا حساب لیے جانے کا خوف..... موت کو گلے لگانا سہل تو نہیں..... یہ تو جی داروں کا کام ہے اور وہ جی دار ہوتا تو کب کا اپنے کرموں کو سوچ کر مر گیا ہوتا.....

☆.....☆.....☆

”تم بہت باہمت ہو!“ میرے ہاتھوں میں اس کا نرم ہاتھ ہولے سے کپکپایا اور ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ ”مہک آپنی! میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا؟ میں نے کسی کا کیا

بگاڑا تھا جو اللہ نے مجھے اس امتحان میں ڈالا؟“ سامعہ نے ایک ہاتھ کی پشت سے اپنے گال بے دردی سے رگڑے اور شکوہ کناں ہوئی۔ اللہ اپنے بندے پر اس کی بساط سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالا کرتا۔ اسے حوصلہ دیتے میں خود ہمت ہار رہی تھی۔ آج پھر رت جگے آنکھوں میں ڈیرا ڈالیں گے..... آج پھر ماضی کی کرچیاں بصارت کو لہورنگ کریں گی۔ سارہ اور عمر آج پھر رات بھر اپنی نوک جھوک سے اس کا دل بہلانے کی سعی میں خود کو ہلکان کریں گے..... آہ میرے بچو! سامنے بیٹھی سامعہ میں مجھے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔

”کیا پھر سے ماضی دہرایا جا رہا ہے؟ کیا آج بھی عورت اتنی بے بس ہے مالک کیسی تقسیم ہے تیری!“

☆.....☆.....☆

”میں کہتی ہوں دوسرے کمرے میں چلی جا!“ صفیہ کو جانے کیوں گل پر اتنا غصہ آ رہا تھا۔

”کیا ہے اماں! میری خالہ اتنی دور سے ہمیں ملنے آئی ہیں آپ ہیں کہ مجھے ان کے پاس بیٹھنے بھی نہ دے رہیں!“ گل رضیہ کے ساتھ اور چپک کر بیٹھ گئی۔

”میری خالہ ہی تو ہیں کوئی رشتہ لانے والی آنٹی نہیں.....“ اپنی بات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگایا اور صفیہ کا بس نہیں چل رہا تھا گل کو منظر سے پس منظر میں کر دے۔ رضیہ کے چہرے کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

کچی اینٹوں کے بنے صحن میں شام کے وقت پانی کے چھڑکاؤ سے اٹھنے والی سوندھی مہک صحن کے کونے پر بنی کیاری سے اٹھتی موتیے کی بھینی بھینی خوشبو کو مات دے رہی تھی۔ لیکن صفیہ اس سب سے بے نیاز سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ رضیہ کچھ دیر اور رک کر چھوٹے بھائی دلاور کی طرف چلی گئی۔ سیالکوٹ سے آنا آسان کب ہوتا ہے؟ دو دن کے قیام میں اپنے سبھی خون کے رشتوں کو تھوڑا تھوڑا وقت بھی دیا تو اڑتا لیس گھنٹے پھر کر کے اڑ جائیں گے۔

☆.....☆.....☆



”اماں!“ گل نے صم بکلم بیٹھی ماں کا شانہ ہلایا تو وہ چونک گئی۔

”اندھیرا پھیل گیا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔“

”آ..... ہاں..... پڑھتی ہوں“ کہا اور چار پائی کے نیچے جوتی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جیسے میلے کی بھیڑ میں پیروں سے چپل نکل جائے اور بھیڑ کا سینہ چیر کر پیچھے کے راستے کو عمیق نظروں سے ٹٹولا جائے۔

”کیا ہو گیا ہے؟“ کہتے ساتھ ہی گل نے ماں کے پیروں میں دوپٹے کی چپل پہنا دی۔

”اللہ تجھے خوش رکھے“ بے اختیار بیٹی کی ادا پر پیار آیا تو جھکے سر پر مہر محبت ثبت کرتے دعا دے ڈالی۔ کھلنڈری گل بھی اس دعا پر جھینپ گئی۔

”آج اماں کو جانے کیا ہوا ہے؟“ خیال کو زبان پر لانے کی ہمت نہ تھی تو سوچ کر رہ گئی۔ اسے خیال ہی نہ رہا کہ اماں کے دعا دینے کے بعد آمین بھی تو کہنا ہے.....

☆.....☆.....☆

”ارے واہ! آج تو میری دھی نے بھنڈی گوشت بنایا ہے۔“ ابا دکان بند کر کے گھر آئے تو گل نے جھٹ پٹ دسترخوان لگا لیا۔ بھوک کی کچی گل رات کا کھانا باپ کے ساتھ ہی کھاتی تھی چاہے دکان بند کرنے میں کتنی دیر کیوں نہ ہو جائے۔ عاطف اور عثمان کی مشترکہ رائے تھی کہ آپا یہ سب ابا کی جیب ہلکی کروانے کو کرتی تھی۔ ان کے چھیڑنے پر یہاں سے وہاں تتلی بنی گل کو پتنگے لگ جاتے اور جو بھی ہاتھ میں ہوتا دے مارتی۔

”تو بتاؤ پھر سارا دن بھوک بھوک کا شور یونہی کرتی ہو!“ عثمان آگے ہی آگے دوڑتا سوال کیے بنا رہ نہ پاتا۔

”آپا دراصل اپنا من پسند جھیز جوڑنا چاہتی ہیں۔ تبھی رات کے کھانے میں ابا کی پسند کے سالن

بنتے ہیں۔ ہمیں سارا دن دال سبزی پر ٹر خاتی ہیں۔“ عاطف بھی لقمہ دینے سے باز نہ آتا اور گل کے ہاتھوں میں دبے اسلحے کا رخ عثمان سے عاطف کی طرف آپوں آپ مڑ جاتا۔

”اللہ یہ ہنسنا بولنا سلامت رکھے۔“ اماں یہ سب دیکھ کر دل ہی دل میں دعا کرتیں۔ لیکن وقت ایک سا کب رہتا ہے؟ کون جانے آنے والا وقت کس کے لیے کیا لے کر آئے؟

☆.....☆.....☆

”رضیہ باجی آئی تھیں۔“ گل کھانے کے بعد اماں ابا کے لیے چائے دے کر نکلی تو اماں کی سرگوشی پر وہ جو باورچی خانے کا جالی والا دروازہ بند کرنے جا رہی تھی جانے کیوں رک سی گئی۔

اماں آج اتنا عجیب برتاؤ کیوں کر رہی ہیں؟“ انجانے خدشے نے سر ابھارا

”شعبان کے لیے گل کا ہاتھ مانگنے!“ اماں کی سرگوشی کمرے کی دہلیز سے باہر نکلی تو گل کا دل ایک پل کو دھڑکنا بھول گیا۔ ”شعبان بھائی تو مجھ سے بہت بڑے ہیں۔“ گل نے سر جھٹکا اور باورچی خانے کے دروازے کی کنڈی لگا کر سونے چلی گئی۔

بلی کھانے پینے کے برتنوں میں منہ مار دیتی تھی تبھی رات کو باورچی خانے کے دروازے کی کنڈی یاد سے لگانا نہ بھولتی۔ لاکھ کھلنڈری سہی لیکن ماں کی دی ذمہ داریوں کو بڑے دل سے نبھاتی تھی۔ میٹرک کے بعد پڑھائی میں دل نہ لگا تو گھر داری کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اس کی سہیلیاں کالج جاتیں اور وہ اماں سے کبھی بریانی تو کبھی قورمے کی ڈشیں بنانا سیکھتی۔ فارغ وقت میں لان میں کھلی بہار کو اور نکھارتی۔ اسے موتیے کی خوشبو بہت بھاتی تھی۔ شام کو سرخ اینٹوں کے بنے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرتی تو طبیعت اور بھی کھل اٹھتی۔ اماں ابا کو اینٹوں سے بنایہ صحن اور کیاری میں لگے پھول پودے بہت عزیز تھے۔ دونوں کا شوق بڑی اولاد میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔ تبھی سرخ اینٹوں کا بنا صحن پکے فرش میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆



رضیہ، صفیہ دوہی تو بہنیں تھیں، دلا اور ان کا اکلوتا بھائی۔ رضیہ کی شادی دور پار کے رشتے داروں میں ہوئی تھی جو سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ صفیہ اور دلا اور بہت قریب قریب رہتے تھے تو رضیہ دوسرے شہر میں۔ یہ دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ بڑی بہن مہمانوں کی طرح سال میں ایک آدھ بار چکر لگالیا کرتی تھی۔ شعبان اور ثانیہ رضیہ کے دوہی بچے تھے تو دلا اور کا ایک ہی بیٹا تھا نعمان۔ صفیہ کے تین بچے تھے۔ گل، عثمان اور عاطف۔ ثانیہ کی شادی دو سال پہلے ددھیال میں ہوئی تھی۔ تب گل کے میٹرک کے امتحانات ہو رہے تھے۔ منظور علی دکان بند نہیں کرتے تھے۔ سو بہن نے بھائی بھاج کے ہاتھ شادی کا تحفہ بھیج کر بہن سے معذرت کر لی تھی۔ اب دو سال بعد بہن بھانجی کا ہاتھ مانگنے آگئی تو صفیہ کیسے انجان شخص کے ساتھ بیٹی بیاہ دیتی جسے بہت سال پہلے دیکھا تھا۔ انجانے خدشے سے دل دھڑک رہا تھا جب کہ منظور علی کے خیال میں یہ رشتہ گل کے لیے مناسب تھا۔ شعبان مقامی اخبار میں نائب مدیر کی پوسٹ پر ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی اخبارات میں کالم بھی لکھتا تھا۔ بظاہر سب ٹھیک لگ رہا تھا لیکن کیا ضروری ہے جو دکھائی دے وہی حقیقت بھی ہو.....



”پھر کیا کہا باجی نے؟“ سلیمہ نے بڑی نند کے کان میں سرگوشی کی۔ دلا اور اس رشتے سے لاعلم تھا۔ کیا خبر صفیہ انکار کر دے تو چھوٹے بھائی کے سامنے سبکی نہ ہو، اسی لیے اس گھر کے سربراہ کو لاعلم رکھا گیا تھا۔ نند بھابھی دھیمی آواز میں گفتگو جاری رکھے ہوئے تھیں۔

”ابھی تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن منع بھی کیوں کرے گی میرے بچے میں کوئی عیب ہے کیا؟“ اپنی بات کے جواب میں جانے کیوں رضیہ نے نظریں چرائیں۔

”اللہ نے آپ کی بھی سن لی باجی! دوسرے شہر میں تنہائی دور ہونے کا سامان بن گیا۔“ سلیمہ نے نند کا ہاتھ دبا کر بھرپور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ سچ تو یہ تھا اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ دلا اور گل کو بہو بنانے

کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنی بھتیجی کو لانا چاہتی تھی رہ گیا نعمان تو اس کی مرضی کس نے دیکھنی تھی جو ماں باپ کہیں گے وہی کرے گا روایتی مشرقی بیٹوں کی طرح اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر..... اسے گل پسند تھی..... لیکن ماں کو نہیں۔

☆.....☆.....☆

گھر میں آنا فنا گل کی شادی کا شور مچ گیا۔ منظور علی نے جانے گل سے کیا کہا کہ بیٹی کا سر آپ ہی باپ کی رضا پر اثبات میں جھک گیا۔ ”بیٹیاں تو مان ہوتی ہیں باپ کا!“ منظور علی کو اس پل گل پر ڈھیروں پیارا آیا۔ رضیہ دو ماہ بعد کی تاریخ اور گل کے کپڑوں جو تون کا ناپ لے کر چلی گئی۔ اور دو ماہ پلک جھپکتے میں بیت گئے۔

☆.....☆.....☆

دیوار گیر گھڑیاں نے سات کا الارم بجایا تو وہ ہڑا کر اٹھ گئی۔ اتنی دیر سونے کی تو وہ عادی نہ تھی پھر آج تاخیر کیسے ہو گئی؟ لمبے گیلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی چہرے کے گرد میروں شال کا ہالہ کیے باہر نکلی۔ رضیہ کچن میں برتن پٹخ رہی تھی۔ ”غضب خدا کا! ہمارے گھر میں آج تک کوئی اتنی دیر تک نہیں سویا۔ ماں نے سکھا کر نہیں بھیجا کیا؟“

”خالہ وہ..... پتہ نہیں چلا بس.....“ گل نے خفت سے سر جھکا لیا۔

”اچھا بس بس اب رونے نہ لگ جانا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے کوئی دیکھے گا تو خاندان بھر میں باتیں بنیں گی۔ تم ذرا کیبنٹ سے کپ نکال کر تو دو مجھے، تمہارے خالو کو چائے کی طلب ہوتی ہے اس وقت۔ ناشتہ تو نوبے تک ہی کرتے ہیں سب!“

”چائے بن رہی ہے یا پائے؟“ امیرالدین کچن کے دروازے کھڑے ترشی سے بولے تو رضیہ کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ بہو کے سامنے سبکی ہو جائے گی، سوچا نہیں تھا۔

”بہو بھی اٹھ گئی۔“ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا گچھا نکالا۔ گل کی نظر اب پڑی تھی۔ وہ ایک کیبنٹ کالا کھول کر چینی پتی کی برنیاں باہر نکال رہے تھے۔ مارے حیرت کے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ کھانے کی ساری چیزیں اس کے خالوتالے میں رکھتے تھے۔

”اپنے لیے چائے اب خود بناؤ!“ ایک کٹوری میں چینی اور پتی اور فرتج سے کپ میں دودھ نکال کر سلیب پر رکھتے ہوئے کہا اور کیبنٹ میں برنیاں رکھ کر پھر سے مقفل کر دیں۔ جاتے جاتے فرتج کالا لگا دیکھنا نہ بھولے۔



دوپہر کا ولیمہ تھا کہ لاہور سے آنے اور پھر جانے میں وقت لگنا تھا سورات کے فنکشن کی بجائے دن میں تقریب رکھی گئی تھی۔ ”گل کچھ دن بعد شعبان کے ساتھ لاہور آجائے گی۔“ کہہ کر رضیہ نے بہن بہنوئی کو رخصت کر دیا اور گل جو اماں سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی، دل میں خواہش دبائے بیٹھی رہی۔



گھر میں کھانے پینے کی تمام اشیا امیر الدین تالے میں رکھتے تھے۔ کب کیا کتنا پکانا ہے؟ سب ان کی مرضی سے طے ہوتا۔ گل کے لیے سب نیا بھی تھا اور عجیب بھی۔ منظور علی صفیہ کو ایک مخصوص رقم دے دیا کرتے تھے۔ اپنی دکان ہونے کے باوجود وہ مہینے کا سودا سلف اپنی ہی دکان سے رقم دے کر منگوا کر تھیں دکان کا بجٹ بھی آؤٹ نہیں ہوتا تھا اور انھیں کم میں مرضی سے گزارا کرنے کی بھی عادت ہو گئی تھی۔ اُسے رضیہ خالہ پر حیرت ہوتی تھی کیسے سب برداشت کرتی ہیں؟ اس گھر کی خواتین ظلم کے ساتھ ساتھ جبر سہتے رہنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ ثانیہ کی شادی کے بعد اس کے حصے کا جبر سہنا برداشت نہ ہوا تو رضیہ بھانجی کو لے آئی۔





”ارے بنجر ہے بنجر! میرے بچے کا کوئی وارث نہیں ہوگا! دیکھ لینا سب“ رضیہ نے سینے پر دو ہتھ مارے۔

”دوسرے ہی مہینے کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ خالہ کاش آپ بیٹے کی الماری میں کپڑوں کی تہہ میں چھپی رپورٹس کی فائل دیکھ لیتیں تو یوں سر عام سینہ کو بی نہ کرتیں۔“

”زبان چلاتی ہے!“ دل کی بات زبان پر لے بھی آتی تو کس نے یقین کرنا تھا پھر شعبان کا ہاتھ اٹھتا تو رکنا بھول جاتا اور یوں رضیہ کے حصے کی آدھی مار گل کا نصیب تو بنتی ہی ساتھ ہی ساتھ رات بھر صحن میں ننگے سر اور پیر کے ساتھ گزارنے کی اذیت بھی جھیلی۔ شعبان ان مردوں کے قبیل سے تھا جو عورت کو پیر کی جوتی نہ صرف سمجھتے ہی ہیں بلکہ وقت پر اس جوتی پر لگی نام نہاد انا کی گرد جھاڑ کر اسے اس کی اوقات بھی یاد دلائے رکھتے ہیں..... پھر چاہے سامنے ماں ہو بہن یا بیوی! ہاں وہ ماں پر تشدد کرتا تھا بد بخت..... بچپن ماں کو مار کھاتے دیکھ کر رخصت ہوا تو سبق دے گیا کہ عورت ہے ہی تشدد کیے جانے کے لائق! چاہے کسی بھی روپ میں ہو!

رضیہ اپنے حصے کی آدھی مار بھانجی کو بہو بنا کر دان کر چکی تھی! وہ کب تک سہتی اسے بھی تو ظلم روا رکھنے کو ایک ایسا وجود درکار تھا جو سہہ بھی لے اور کہہ بھی نہ پائے!

”اماں!“ رات کے آخری پہر صحن کی تیخ دیوار سے کمر نکائے گل نے سسکی بھری۔

☆.....☆.....☆

”میں سیالکوٹ جا رہا ہوں۔ رات بھر کروٹیں بدلتے منظور علی نے صبح ناشتے کے برتن سمیٹتی صفیہ سے کہا تو وہ بھی بے چین ہو گئی۔“ میں بھی جاؤں گی!“ رات بھر وہ بھی سو نہ پائی تھی۔ ”جانے پہلوئی کی اولاد دوسرے شہر میں کن حالوں میں ہو؟“ سوچ کر رہ گئی لیکن کہہ نہ پائی۔

”ابا آپ دکان کی طرف سے بے فکر ہو کر جائیں۔“ عثمان نے کہتے ہی نظریں چرائیں۔ شعبان

کو کتنے ہی فون کیے بہن سے بات کروادے۔ ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیا جاتا۔ ”آپا کو ایک فون ہی لے دیں۔“ اپنے سے کئی سال بڑے بہنوئی سے کہنے کی ہمت نہ کر پاتا۔

☆.....☆.....☆

”ارے بانجھ ہے یہ! مرجاؤں گی پوتے پوتی کھلانے کی آرزو لیے.....“ رضیہ کی تیز آواز گیٹ سے باہر نکلی تو نبیل پر ہاتھ رکھتے منظور علی کا ہاتھ بے اختیار دل پر آیا۔

”پتہ نہیں کیسے ماں باپ ہیں؟ بیٹی دے کر خبر ہی نہیں لیتے“ برابر کے دروازے سے باہر نکلتے بزرگ نے بلند آواز سے افسوس کیا تو دونوں کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا سو نبیل دینے کا تکلف کیے بنا دونوں اندر چلے گئے۔ ”بیٹی کی دو روٹیاں بھاری نہیں مجھے! غلط ہوا ہے تو صحیح بھی میں کروں گا۔“ یہ سوچ لیے وہ اندر داخل ہوئے تو گل سر جھکائے خود پر لگائے جانے والے الزامات سہہ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے یہاں؟“ منظور علی سالی کے آگے دو بدو ہوئے تو رضیہ گڑبڑا گئی۔ گل بھی اماں باوا کو اچانک سامنے پا کر ڈر گئی۔ ”اب جانے کیا ہو؟ ابا تو کیا کبھی اماں نے بھی اسے ہاتھ نہ لگایا تھا اب یہ عالم تھا کہ مجازی خدا کی مار سہتی اور رات بھر بد لے میں سزا بھی کاٹتی۔

”کچھ بھی تو نہیں..... چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں.....“

”چھوٹی چھوٹی باتیں گھر کی دہلیز پار کرنے لگیں تو چھوٹی نہیں رہتیں۔“

”ہاں ہاں لیس جاؤ اپنی بد کردار اولاد کو یہاں سے! لیکن یاد رکھنا واپس یہیں آئے گی یہ! نہ آئی تو زمین تنگ کردوں گا اس پر موت کی آرزو میں سکتی پھرے گی“ شعبان نے لحاظ کا چولا اتار پھینکا اور دھمکانے پر اتر آیا۔ ابلاغیات کا ڈگری یافتہ معروف یوٹیوبر، کالم نگار، نائب مدیر اپنی زبان سے مغالطات بکتا اپنے نام سے پہلے لگے اعزازات کی نفی خود ہی کر رہا تھا۔ کاش کہ کسی یونیورسٹی میں اخلاقیات کی

ڈگریاں بھی ملا کرتیں!

”منظور بھائی آپ میری بات سنیں اسے چھوڑیں جوان خون ہے پھر گل سے پیار بھی تو بہت کرتا ہے۔ بیوی کے جانے کا سن کر غصہ کر رہا ہے۔ گل! میری بچی! خیر سے جا، جب آنا ہو خالہ کو فون کر دینا میں اپنی بیٹی کو لینے آ جاؤں گی۔“ رضیہ نے مصلحتاً محبت کا مظاہرہ کیا۔ گل خالی نظروں سے کبھی اپنے ماں باپ کو دیکھتی اور کبھی زہرا گلتے جیون ساتھی کو تو کبھی خالہ کے پینترے بدلنے کو..... صفیہ اور منظور علی خاموشی سے گل کو اپنے ساتھ لے گئے۔

”اب لاہور جا کر ہی بیٹی سے بات کریں گے۔“

☆.....☆.....☆

”چچی اتنا بڑا تو گھر ہے ان کا، ہماری سدرہ کے نصیب جاگ جائیں گے۔ آپ مجھ پر بھروسہ تو کریں۔“ تانیہ کب سے چچی کو رام کرنے کی تگ و دو میں تھی۔ اس کے دور پار کے سسرالی رشتے داروں نے سدرہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ ”ایسے کیسے بیٹی دے دوں؟ میں انھیں جانتی بھی نہیں۔ سدرہ کتنے کرب سے گزری ہے یہ سارا خاندان جانتا ہے۔ بد بخت نے کیسا ظلم ڈھایا میری پھول جیسی بچی پر۔ اب زندگی کی طرف لوٹی ہے تو تم کہتی ہو اجنبیوں پر بھروسہ کر لوں۔ نہ چندا! یہ مجھے سے نہیں ہوگا۔“ چچی نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ اچھا آپ میرے ساتھ چلیں گھر بار سب دیکھ لیں۔ دل مانے تو ہاں نہیں تو ناں۔“ تانیہ نے ہار نہیں مانی۔

☆.....☆.....☆

گل رات کو اکثر نیند میں ڈر جاتی۔ کبھی بڑبڑانے لگتی۔ صفیہ کان لگا کر سنتی تو مانو دل چر جاتا۔ شعبان اتنا گھٹیا انسان نکلے گا یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ گھر میں سوگ کی سی حالت تھی۔ عثمان عاطف الگ پریشان تھے ان کی ہنسنے بولنے والی آپا کو چپ لگ گئی تھی۔



”اماں! یہ گندی عورت کیسی ہوتی ہے؟ شعبان مجھے گندی عورت کہہ کر بلاتا تھا۔ خالہ کہتی تھیں۔ چھنال ہے یہ! اماں یہ چھنال کون ہوتی ہے؟“ اور صفیہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ ایک ہی ماں کے بچے ایک دوسرے سے کیسے اتنے مختلف نکلتے ہیں؟

”اماں وہ خالہ کو بھی مارتا ہے۔ اسے ڈر نہیں لگتا اللہ سے؟ کہتا ہے تم عورتیں ہو ہی اسی لائق! خالہ تو اس کی ماں ہیں کوئی ایسا کیسے کر سکتا ہے۔“ دماغی رو بہکنے لگتی تو بولتی ہی چلی جاتی۔ ”بد بخت کی قبر میں کیڑے پڑیں گے۔ دنیا میں بھی عذاب جھیلے گا۔“

”نا اماں بد دعا نہ دینا بس اللہ پر چھوڑ دو میں نے بھی تو چھوڑ دیا ہے نا! وہ حساب لے گا۔“ گل کے آنسوؤں میں روانی آ جاتی تو صفیہ اسے اپنے بازوؤں کے ہالے میں چھپا لیتی۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا ان چند مہینوں میں۔

گل کا علاج چل رہا تھا۔ اس کی معالج نے صفیہ کو اس کا سایہ بنا رہنے کو کہا تھا۔ وہ بولے تو گھر کے سارے کام چھوڑ کر اسی کو سنا جائے۔ ایک روز اخبار میں کالج کا اشتہار دیکھا تو بے اختیار گل نے بے بسی سے جلی حروف میں لکھے ایڈمیشن پر ہاتھ پھیرا۔ پڑھائی سے دور بھاگنے والی کے دل میں بہت سارا پڑھنے کی خواہش مچنے لگی تھی۔



”اماں وہ مجھے مار دے گا“ سدرہ نے رات کے اس پہر ماں کے پیچھے چھپنا چاہا۔ ”کوئی بھی تو نہیں ہے یہاں۔ اچھا سن ادھر میرے ساتھ ہی لیٹی رہ۔ نیند نہیں آرہی تو بتا دے ہم دونوں بہت ساری باتیں کریں۔“ ماں نے نرمی سے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ماں کا دل کٹ جاتا اسے اس حالت میں دیکھ کر۔ کیسے ظالم تھے ظلم ڈھاتے تھکتے نہ تھے۔ نہ ان کے سورج غروب ہونے میں آرہے تھے۔ کبھی دھمکی آمیز فون کالز تو کبھی گھر پر پتھر اڑا دیا جاتا۔

”نکاح پر نکاح کرے گی بدکردار! دیکھنا تیری بیٹی کو کہیں چین نہیں لینے دوں گا۔ موت کی آرزو میں تڑپتی رہے گی۔“ ہر بار یہ دھمکی دی جاتی اور ہر بار بیٹی سے سب چھپایا جاتا۔ جانے کس نے سدرہ کے رشتے کی خبر وہاں کر دی تھی؟

☆.....☆.....☆

”چچی آپ نے بتایا نہیں پھر!“ تانیہ نے دو دن جانے کیسے صبر کیا؟ چچا کے دکان پر جاتے ہی آگئی۔ سدرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کو اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“ دیور کی بیٹی کے سامنے بے بسی ظاہر کی۔ ”اس کی شادی نہیں کریں گی تو وہ یونہی دھمکیاں دیتا رہے گا۔“ تانیہ کو کیسے پتہ چلا؟

”پورا خاندان جانتا ہے کہ وہ دھمکیاں دے رہا ہے۔ نکاح پر نکاح کی حد جاری کروائے گا یہی کہا ہے نا! کب تک اسے چھپا کر رکھیں گی کبھی تو رخصت کرنا ہی ہے۔ دوسرے مرد کا ساتھ ملے گا تو وہ بھی پیچھے ہٹ جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اسے اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔ کسی بھی مشکل میں تعلیم ہی اس کی ڈھال بنے گی۔ معاشی طور پر خود کفیل عورت سے مرد ڈرتا ہے۔ جو بھی مشکل وقت ہے اسے سہنا تو ہوگا۔“ گل کے چیک اپ کے بعد صفیہ سے اکیلے میں بات ہوئی تو اس کے زندگی کی جانب واپس لوٹنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ معالج کے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ مریض علاج پر راضی تو ہے ہی ساتھ ہی خود کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار بھی کرے۔

☆.....☆.....☆

”اماں میں پڑھنا چاہتی ہوں بہت ساری ڈگریاں لینی ہیں مجھے۔“ گل نے ماں کے سامنے اپنی خواہش رکھی تو صفیہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ ”صبح چلیں گے۔“

صبح بڑی خوش گوار ہوئی تھی۔ ایک مدت کے بعد گل نے سب کے لیے ناشتہ بنایا تو عثمان اور عاطف نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے۔ ”آپا ٹھیک ہوتی جا رہی ہیں۔“ باپ کے بیٹھنے پر گرم گرم پراٹھے اور آلو کی بھجیا رکھتی بیٹی کو دیکھ کر بے اختیار منظور علی کو اس پر پیار آیا۔ ”اللہ ہمیشہ ایسا ہی رکھے۔“

”ابا! جلدی سے فیس کی رقم دیں مجھے۔ کچھ کپڑے اور کتابیں بھی لینی ہیں۔ اماں کے ساتھ کالج جا رہی ہوں۔ سارے کام آج ہی کریں گے۔“ گل کے لہجے میں عجلت تھی۔ ”آپا آپ کے ہاتھ سے پڑنے والے بیلن کی مار بہت یاد آتی ہے۔“ عاطف کی زبان پھسلی۔

”بے فکر رہو تسلی سے مارا کروں گی اب، تمہاری آپا کمی نہیں چھوڑے گی۔“ چائے کا کپ خالی کرتی اطمینان سے بولی تو دونوں بھائیوں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

☆.....☆.....☆

”ابا آپا کی خلع کے پیپرز تیار کروا رہا ہوں۔ سلمان کے بڑے بھائی ہماری مدد کرنے پر تیار ہیں۔ کب تک آپا اس زہریلے بندھن میں قید رہیں گی۔“ عثمان نے باپ کے سامنے لائحہ عمل رکھا تو منظور علی نے بھیگی مسوں والے اس نوجوان کو دیکھا جس کے لہجے سے بہن کے لیے تفکرات جھلک رہے تھے۔ ”وقت کی سختی نے میرے بچوں کو بہت جلدی بڑا کر دیا۔“ عثمان پری انجینئرنگ کے پہلے سال کا امتحان دے کر چھٹیوں میں باپ کے ساتھ دکان پر کچھ دیر رہتا پھر کوچنگ سینٹر چلا جاتا۔ وہاں وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھاتا بھی تھا۔ سلمان اس کا واحد دوست اور راز دان تھا۔ گل کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی سے واقف تھا۔ عثمان بھی چاہتا تھا کہ گل نئے سرے سے زندگی شروع کرے۔ آج صبح گل کے امید افزا رویے سے اس کا آغاز ہوا تو باپ سے بات کرنا مناسب سمجھا۔

☆.....☆.....☆

کالج میں سٹوڈنٹس کا رش، وہی گہما گہمی جو عموماً کالجز کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ ابھری ہوئی سرخ



اینٹوں کی دیواریں۔ ایڈمن بلاک میں کلرکوں کے 'جلدی کرو! جلدی کرو!' کا شور مچانا جسے سوچ کر ہی کبھی گل کو گھبراہٹ ہوتی تھی، آج بالکل بھی برانہ لگا۔ گل کا داخلہ تاریخ نکلنے کے باعث ڈبل فیس کے ساتھ بالآخر ہو ہی گیا تھا۔ کتابوں رجسٹروں اور یونی فارم کے بڑے بڑے شاپراٹھائے گھر واپسی ہوئی تو عثمان اور عاطف جو کھانا کھانے گھر آئے تھے آپا کے ہاتھوں سے خریداری کے شاپر چھین کر گول گول گھومنے لگے۔ گل تھکی ہوئی تو تھی انگوڑی بیل کے سائے میں دھری چار پائی پر سستانے لگی۔

”بدتمیزو! بہن کو پانی کا پوچھا نہیں اور لگے ستانے!“ خفگی کا اظہار کیا تو عثمان جھٹ پٹ پانی کی بوتل اور گلاس لیے بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ ”لو آپا کیا یاد کرو گی!“ اس کے مؤدب انداز پر صفیہ بھی ہنسنے لگی۔ ”تم تو اس وقت کو چنگ سینٹر میں ہوتے ہونا!“ پانی کے دو گلاس پینے کے بعد گل کو یاد آیا تو بھائی کی کلاس لینا نہ بھولی۔

”وہ..... میں..... اپنی اماں اور آپا کو کھانا دینے آیا تھا۔ آپ تھکی ہوئی آئیں گی یہی سوچ کر جیب ہلکی کی۔ سلیب پر رکھا ہے گرم کر کے کھا لیتا۔ ہم دونوں نے تو کھا لیا ہے اب جارہے ہیں اور ہاں یاد سے! یہ سارے شاپر میں خود کھولوں گا شام کو خبردار جو کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو.....“ عثمان کی پیار بھری دھمکی پر گل نے ہاتھ میں پکڑا سٹیل کا گلاس اسے مارنے کو اوپر کیا تو اس نے بھاگنے میں عافیت جانی۔

”میرے لیے کیا حکم؟“ عاطف مسخروں کے انداز میں جھکا تو گل نے سٹیل کا گلاس چھوٹے بھائی کی کمر پر جڑ دیا۔ بڑا نہیں تو چھوٹا سہی اور جواب میں عاطف کی ”آ..... اوئی..... ہائے مر گیا“ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ عثمان ہمیشہ بچ جایا کرتا بلکہ عاطف اس کی ڈھال بنا آگے آتا اور بڑے بھائی کو ہمیشہ آپا کی مار سے بچا لیا کرتا تھا۔



رات اپنے جو بن پر تھی۔ پورا چاند صحن میں پھیلی چاندنی رات کی رانی کی خوشبو اور چار پائی پر پیر

لٹکائے اپنا بکھرا وجود لیے بیٹھی تھی۔ سارا دن خود کو سنبھالنے کی تگ و دو میں اب ہلکان ہو گئی تھی۔ عثمان بہن کو کمرے میں نہ پا کر باہر آیا:

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ باپ سے بہن کی خلع کی بات کرنے والا یہ نوجوان اب بہن کو قائل کرنا چاہتا تھا۔ ”سلمان کے بھائی ایڈووکیٹ ہیں۔ وہ ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔“ عثمان نے تمہید باندھی۔

”بہن پرداغ لگوانے میں مدد.....“ گل کے لہجے میں تلخی گھلی۔

”آپا! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ طلاق یا خلع اللہ کا ناپسندیدہ عمل ضرور ہے لیکن حلال ہے۔ حرام ہوتا تو کبھی دین میں اس کی گنجائش نہ ہوتی۔ آپ کے سامنے زندگی کی طویل شاہ راہ ہے۔ ایسے کیسے زہریلے بندھن کو زبردستی ساتھ لیے چلیں گی۔“ بھائی نے بہن کو مثبت قائل کرنا چاہا۔

”تم سے کس نے کہا میں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں؟ وہ باپ نہیں بن سکتا اور بے اولادی کے سارے الزام میرے سر.....“ گل کی دماغی روپھر سے بہکی تو بھول گئی کہ اس کی بات سننے والی صفیہ نہیں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ایک دوسرا مرد ہے۔ جوش میں بھی آگیا تو ہوش کھو بیٹھے گا۔ عثمان شرم سے پانی پانی ہو گیا کیسے کیسے دکھ جھیل کر آئی ہے اس کی بہن

”میں بہت سارا پڑھنا چاہتی ہوں۔ اپنا مقدمہ آپ لڑوں گی۔“

”اور میں چاہتا ہوں آپ نئی زندگی کا آغاز ہر بوجھ سے آزاد ہو کر کریں.....“ عثمان بات کے اختتام پر کھڑا ہو گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی طویل راہ داری کے آخری سرے پر بنے اپنے کمرے کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اسے بھی تنہائی درکار تھی۔ بہن کی آزمائش پر رونے کی آج آخری رات تھی۔ آنے والی صبح کا سورج نئے عزم کے ساتھ دیکھنا تھا۔





”ٹھیک ہے جو آپ کو بہتر لگے۔ میرا دل پہلے بھی مطمئن نہیں تھا۔ شعبان ایسا نکلے گا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ رضیہ باجی اتنا بڑا دھوکا کیسے دے سکتی ہیں ہمیں؟“ صفیہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”اماں کھڑا وہی ہوتا ہے جسے ٹھوکر لگے۔ ہم چاروں نے مل کر آپا کو سنبھالنا ہے۔ مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔“ عثمان نے ماں کو ساتھ لگاتے ہوئے نرمی سے آنسو پونچھے تو صفیہ کو جہاں بیٹے کے تفکر پر طمانیت کا احساس ہوا وہیں اپنے بچوں کا لالہ ابالی پن رخصت ہونے پر دکھ بھی ہوا۔

☆.....☆.....☆

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔ گل عثمان کے ساتھ کالج جاتی۔ ٹھنڈی کے وقت بھی وہ بہن کو لینے گیٹ پر کھڑا ہو جاتا۔ آج جانے کیوں اُسے دیر ہو گئی تھی۔ وہ باہر نکل کر دیکھنے لگی پھر کالج کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگائے بھائی کا انتظار کرنے لگی کہ سیاہ بحیر و پاس آ کر رکی اور اسلحہ بردار گاڑی کے دروازے کھول کر اس کی جانب بڑھے۔ گل کے اوسان خطا ہو گئے۔ سرتا پیر سیاہ لہادے میں ہونے پر بھی شعبان نے اسے پہچان لیا تھا۔

”کہاں تک چھپے گی میری چڑیا!“

☆.....☆.....☆

کالج کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگائے وہ عثمان کی منتظر تھی۔ اسے وہاں کھڑے کافی دیر گزر گئی تھی۔ چھٹی کے بعد ہونے والی بھیڑ کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گئی تھی لیکن عثمان کا کچھ پتہ نہ تھا کہ ایک سیاہ رنگ کی بحیر و پاس آ کر رکی۔ گل تھوڑا سا سیڈ پر ہو گئی شاید پارکنگ کے لیے جگہ درکار ہو۔ گاڑی کے دروازے کھلے اور مسلح گارڈز باہر نکلے۔ گارڈز کے باہر آنے کے بعد کوئی اور بھی باہر نکلا۔ ہاں وہ شعبان تھا۔ سفید بے داغ کلف لگے کاٹن کے سوٹ کی اکڑا ہٹ گردن میں بھی واضح ہو رہی تھی۔ سیاہ پشاور چیل میں مقید وہ مینی کیورڈ پیر جو کبھی اس کے گردن پر رکھے جاتے تھے۔ کرتے کی نادیدہ گرد



ایک جھٹکے سے جھاڑ کر سیدھا ہوتا وہ زمینی خدا..... اس نے گل کو سرتا پیر سیاہ لبادے میں ملبوس ہونے کے باوجود پہچان لیا تھا..... ”اب یہ کیا کرنا چاہتا ہے“ خوف کی سرد لہر اس کے وجود میں سنسنی دوڑا گئی.....

”عثمان کہاں رہ گیا؟“ روم روم سے بے بسی چھلکی تو خوف و تحیر کے ملے جلے تاثرات والی نظریں..... ”اللہ میری مدد کرنا!“



”ایک ہی بہن ہے اس کی شادی ہو گئی تو سدرہ ہی مالکن ہوگی گھر کی۔ رہ گئے ماں باپ تو آج مرے کل دوسرا دن.....“ تانیہ چچی کو رام کرنے میں لگی تھی۔

”میں اپنے بیٹوں کے لیے لڑکیاں دیکھنے جاؤں اور انھوں نے شرط رکھ دی کہ ماں باپ زندہ نہ ہوں تو کیا مجھے یہ بات صحیح لگے گی؟“ چچی کے سوال پر گڑبڑا گئی۔

”نن..... نہ..... چچی میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“

”جو بھی مطلب ہو جو بات مجھے اپنے بیٹوں کے لیے پسند نہیں اس کی چاہ میں بیٹی کے لیے کیسے کروں؟“

وہ دونوں یہ باتیں کر رہی تھیں کہ سدرہ چائے کی ٹرے اور دیگر لوازمات لیے کمرے میں چلی آئی۔ اسے دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئیں۔ وہ میز پر ٹرے رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے شادی نہیں کرنی، تانیہ آپنی!“ اس نے قطعیت سے کہا اور منظر سے اوجھل ہو گئی اور تانیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”یہ کیا کہہ گئی؟ چچی!“ اس کے منہ سے بس یہی نکلا تو وہ بھی تاسف سے بولی:

”برا بھی تو بہت ہوا ہے اس کے ساتھ!“



”تو اب میری چڑیا اڑنا چاہتی ہے!“

”تنسیخ نکاح کا نوٹس بھیجے گی مجھے! تیری اتنی ہمت! جوتی کے نیچے آئی چیونٹی کی طرح مسل کرتی رکھ دوں گا لیکن آزاد نہیں کروں گا۔ شعبان امیر الدین کے سامنے سراٹھانے کی غلطی جس کسی نے بھی کی اسے میں نے یوں ہی مسل کر رکھ دیا۔“

”اور زمین میں اکڑا کر نہ چلو کیونکہ نہ تو تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی تم طول میں پہاڑوں تک پہنچ سکتے ہو۔“ اسے یاد آیا قرآن کی سورہ بنی اسرائیل میں اللہ نے اپنے بندوں کو کیا تنبیہ کی ہے۔ اسی سوچ میں گم تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا کر اپنے پیروں کی جانب اشارہ کیا جہاں چپل تلے ان چیونٹیوں کے مسئلے ہوئے لاشے پڑے تھے جو رزق کی تلاش میں گھر سے نکلی تھیں اب جاڑے کے ٹھٹھرتے پلوں میں اپنی پناہ گاہوں میں محفوظ رہ کر دن بتانے کو گرم موسم میں مارے مارے پھرنے کی قید سے رہائی پا گئے تھے۔

اسی سورہ کی دوسری آیت یاد آئی:

”رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی کے ساتھ چلتے ہیں۔“  
 ”آپا چلیں! عثمان نے دیکھا ان دیکھا کرتے ہوئے بہن کو مخاطب کیا۔“

”دیکھ لوں گا تم سب کو.....“ شعبان نے رعونت سے اس سترہ سالہ لڑکے کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

عثمان نے رکشہ ایک جوس کارنر کے باہر رکھ دیا تو گل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جواب میں بھائی نے کچھ بھی کہنے کی بجائے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ کھجور شیک کا گلاس اس کے سامنے رکھا تو گل کو بھائی کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

”حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں خود کو تیار بھی تو کرنا ہے۔“ گل کی آنکھ سے ایک آنسو گرا

اور میز کی کھر دری سطح میں گم ہو گیا۔

”آپا! میں ابھی کم زور ہوں۔ مقابلے پر اتر بھی آؤں تو ابا کے جھکے کندھے، اماں کی فکریں، عاطف کی فینسیں آپ کے دکھوں کا مداوا لڑ بھڑ کر ہوتا، تو میں انھیں آپ کو اتنا کچھ کہنے ہی نہ دیتا۔ وہیں دماغ درست کر کے آتا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ اسی لیے مزاحمت سے خود کو دور رکھ کر مقابلے کی تیاری کر رہا ہوں۔ کبھی تو اس ظلم کا سورج غروب ہوگا۔“ بھائی کے کہنے پر بہن کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

☆.....☆.....☆

”اسٹوڈیو چلو! زوجین کے حقوق و فرائض پر آج لائیو سیشن ہے۔“ قول و فعل کے تضاد کی عملی تفسیر نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ ڈرائیور نے بے تاثر چہرے سے ہدایات سنیں اور گاڑی کا رخ ’شعبان اسٹوڈیو‘ کی جانب موڑ دیا۔ معروف یوٹیوبر کو اکثر اصلاحی ویڈیوز کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں لاہور میں بنے اپنے اسٹوڈیو آنا ہوتا تھا۔ آج اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے..... قید سے رہائی پانے کی جہد مسلسل میں برسرِ پیکار ایک کمزور عورت کو اس کی اوقات یاد دلانا..... دوسرا اہم کام اپنے اندھے عقیدت مندوں کو صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہ دینا..... اصلاحی بیان کو آواز کے بہترین اتار چڑھاؤ کے ساتھ..... درستی کی حاجت تو دونوں کو ہی بروقت مطلوب تھی پھر چاہے سرائٹاتی عورت ہو یا راہ سے بھٹکے اندھے پیروکار.....

☆.....☆.....☆

”میں اپنی آپا کو بہت مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگلی بار جب وہ سامنے آئیں تو آپ کے تاثرات عکاسی کرتے ہوں کہ آپ کے آگے بڑھتے رہنے کے سفر کو ان دھمکیوں سے رتی برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔“ جوس کارنر کے کونے میں رکھی پلاسٹک کی اس بے رنگ میز کے آگے رکھی بدنمائی کرسی پر



بیٹھے ایک بھائی نے اپنی بہن سے عہد لیا۔

☆.....☆.....☆

”عورت مرد کی ٹیڑھی پسلی سے نکلی ہے۔ سخت کرو گے تو ٹیڑھ بھی دکھائے گی اور نفسیاتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہوگی۔ قرآن میں اللہ رب العزت نے عورتوں کے معاملے میں نرمی دکھانے کا حکم دیا ہے۔“ ایک سوال کے جواب میں لہجے میں جہان بھر کی نرمی سموئے اس نے اپنے پیروؤں کا دل جیتنا چاہا لیکن لائیو سیشن میں دیے جانے والے اس جواب پر ایک سوال کیا گیا۔

”وہی نرمی جس کا مظاہرہ تم ابھی کر کے آئے ہو!“ کمنٹ کرنے والا آف لائن ہو گیا تھا۔ سر سے لگی تلووں پر بجھی ضرور، لیکن سچویشن ایسی تھی کہ سخت رد عمل اس کے فالوورز کم تو کرتا ہی ساتھ ہی اس کی ساکھ بھی متاثر ہوتی۔

☆.....☆.....☆

”پیارے! اس کے لائیو سیشن میں ایسا کمنٹ کیا ہے کہ جلے پیر کی بلی بنا اچھل رہا ہوگا!“

”یار کیوں اپنی جان مصیبت میں ڈالتا ہے“ عثمان خفا ہوا لیکن سلمان مزے سے کافی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ عثمان کی آپا پر آئی آزمائش کی گھڑی میں اس نے ہر طرح سے اپنے اکلوتے یار کی مدد کرنا ہی تھی۔ خواہ بات ظالم کے سامنے کلمہ حق کہنے کی ہو یا کورٹ کچہری کے معاملات.....

☆.....☆.....☆

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ رضیہ ثانیہ کو لیے ان کے دروازے پر سینہ کو بی کر رہی تھی۔

”خالہ! اندر چلیے!“ عثمان نماز کے بعد پارک میں جا گنگ کے بعد گھر لوٹا تو تماشہ منتظر تھا۔ نرم لہجے اور ہاتھ کی سخت گرفت سے رضیہ کو اندر لے آیا۔ عاطف دلا اور کو لینے گیا کہ خالہ کے واویلے پر وہ جو ابھی تک اس قضیے سے لاعلم تھے، وہ ہی بند باندھ سکتے تھے۔

”یہ کہاں جا رہی ہے؟“ عثمان گل کو لیے نکلا تو رضیہ ترشی سے گویا ہوئی۔

”آپا کالج میں پڑھتی ہیں۔“ عثمان نے مڑ کر جواب دیا اور بہن کو لیے نکل گیا۔ رضیہ ہکا بکارہ

گئی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہاں سب آگے بڑھ چکے ہیں۔

”ہونہہ کیا کرے گی پڑھ کر.....“ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

”کم از کم وہ نہیں کرے گی جو آپ کا بیٹا کر رہا ہے۔“ صفیہ نے سرد لہجے میں کہا تو بڑی بہن کو

حالات کی سنگینی کا ادراک ہوا۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

”باجی شعبان کو ایک موقع تو ملنا چاہیے نا!“ دلاور نے چھوٹی بہن سے منت کی۔

”کل اس نے میری بچی کو کالج کے باہر دھمکیاں دیں۔ آج تم کہتے ہو کہ ایک موقع تو ملنا چاہیے۔

اس مرد کو جو اپنا جسمانی عیب میری بچی پر بے اولادی کے الزامات لگا کر چھپانا چاہتا ہے.....“ بھانجے کا

مقدمہ لڑتے دلاور کی زبان ایک پل کو گنگ ہوئی۔ اُسے بہت ساری باتوں سے لاعلم رکھا گیا تھا۔

”گھر بسانے کو سب مار کھاتے ہیں۔ گل شوہر کی مار کھا کر کوئی انوکھا کام نہیں کر رہی۔“ رضیہ نے

منطق پیش کی

”کہاں لکھا ہے کہ مار کھائی جائے تو ہی گھر بستے ہیں؟“ منظور علی بھی بول پڑے۔

”لکھا تو ہے قرآن میں.....“

”بس کر دیں باجی..... کس عورت کے لیے کس درجے پر اس کا حکم ہے جانتی ہیں؟ نہیں اسی لیے

آدھے علم کی بنیاد پر کہہ رہی ہیں۔ ہماری گل ہماری عزت ہے اس پر غلاظت پھینکنا اپنے اوپر ہی گندگی

ڈالنا ہے۔“ دلاور کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

”اسی قرآن کی سورہ نور کی چوتھی آیت میں لکھا ہے کہ

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسی دُڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، اور وہی لوگ نافرمان ہیں۔“ (منظور علی نے یاد دلاتے ہوئے کہا) ”اب کیا کہیں گی آپ؟ افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے اپنے فیصلے پر بڑا مان تھا۔“ باپ کے لہجے میں تاسف گھلا۔

”رضیہ باجی آپ نے اچھا نہیں کیا، بہتر ہوگا کہ اس باب کو اب بند کر دیا جائے۔ گل میری بیٹیوں جیسی ہے آپ ایسا کیسے سوچ سکتی ہیں کہ اس پر ظلم ہوتا رہے اور ہم شکایت بھی نہ کریں۔“ دلاور کو بڑی بہن کے رویے سے شدید صدمہ ہوا تھا۔

”کیسے ماموں ہو گل کا گھر اجاڑنے کی بات کرتے ہو! سراسر بہتان ہے میرے بیٹے پر.....“

”کون سا گھر باجی! وہ..... جو آباد ہی نہیں ہوا!“ دلاور کو بڑی بہن سے یہ امید نہ تھی۔

”کاش یہ سچ نہ ہوتا! اور ثبوت کی فائل الماری میں کپڑوں کی تہہ میں دبائی نہ گئی ہوتی۔ باجی آپ نے ہم سب کے ساتھ اچھا نہیں کیا!“ صفیہ کے لہجے میں تاسف تھا۔ ثانیہ ماں کو لے کر چلی گئی کہ ان کے ”قوام“ نے انہیں کسی کو منہ دکھانے لائق نہ چھوڑا تھا۔

☆.....☆.....☆



## قسط نمبر 2

”رضیہ باجی آپ نے اچھا نہیں کیا بہتر ہوگا کہ اس باب کو اب بند کر دیا جائے۔ گل میری بیٹیوں جیسی ہے آپ ایسا کیسے سوچ سکتی ہیں کہ اس پر ظلم ہوتا رہے اور ہم شکایت بھی نہ کریں۔“ دلاور کو بڑی بہن کے رویے سے شدید صدمہ ہوا تھا۔ ”کیسے ماموں ہو گل کا گھر اجاڑنے کی بات کرتے ہو! سراسر بہتان ہے میرے بیٹے پر.....“

”کون سا گھر باجی! وہ جو آباد ہی نہیں ہوا!“ دلاور کو بڑی بہن سے یہ امید نہ تھی۔

”کاش یہ سچ نہ ہوتا! اور ثبوت کی فائل اس کی الماری میں کپڑوں کی تہہ میں دبائی نہ گئی ہوتی۔ باجی آپ نے ہم سب کے ساتھ اچھا نہیں کیا!“ صفیہ کے لہجے میں تاسف تھا۔ ثانیہ ماں کو لے کر چلی گئی کہ ان کے ”قوام“ نے انھیں کسی کو منہ دکھانے لائق نہ چھوڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

زمین تنگ کرنے کی دھمکیاں دینے والے سے جانے کیا کہا گیا۔ طلاق کے کاغذات بھیج دیے گئے۔ گل کی زندگی کی کتاب میں شعبان کا باب بند ہو گیا تھا! عورت کا سراٹھانا، مرد کی اناسب کہیں وقت کی گرد تلے دب گیا تھا! یہ گرد کب تک جمی رہے گی کسی کو نہیں معلوم تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت دیر سے ہی سہی، رینگنا شروع ہو گیا تھا۔ گل نے بی اے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ایم

اے اردو میں داخلہ لے لیا تھا۔ عثمان کی انجینئرنگ مکمل ہو گئی تھی۔ اس کی جاب شروع ہو گئی تھی۔ عاطف کا ہاؤس جاب شروع ہونے کے قریب تھا۔ زندگی کچھ مصروف کچھ مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ منظور علی اب بیمار رہنے لگے تھے۔ بلڈ پریشر اکثر بڑھ جاتا۔ اس سب میں صفیہ البتہ چٹان بنی کھڑی تھی۔ بچوں کی پشت پر اس کا حوصلے سے کھڑا رہنا اسے کرنے ہی نہ دیتا تھا۔ اسی دوران تانیہ جواد کا رشتہ لیے چلی آئی۔ جواد اس کے دور پار کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھا۔

”ملٹی نیشنل کمپنی میں بڑی اچھی نوکری پر ہے۔“

سدرہ گل کی زندگی میں اب کیا ہونے جا رہا تھا؟ کسی کو خبر نہ تھی۔ یہ اسی رات کی بات ہے ایک عرصے کے بعد وہ نیند میں ڈر گئی تھی! صفیہ کے رت جگوں کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا۔ ننھیال والوں کی گل اور خاندان کی سدرہ کی زندگی میں ایک اور مرد آنے کا خواہاں تھا!

☆.....☆.....☆

”چچی اتنا بڑا تو گھر ہے ان کا، ہماری سدرہ کے نصیب جاگ جائیں گے۔ آپ مجھ پر بھروسہ تو کریں۔“ وہ کب سے چچی کو رام کرنے کی تگ و دو میں تھی۔ اس کے دور پار کے سسرالی رشتے داروں نے سدرہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ ”ایسے کیسے بیٹی دے دوں؟ میں انھیں جانتی بھی نہیں۔ سدرہ کتنے کرب سے گزری ہے یہ سارا خاندان جانتا ہے۔ بد بخت نے کیسا ظلم ڈھایا میری پھول جیسی بچی پر۔ اب کچھ سالوں سے زندگی کی طرف لوٹی ہے تو تم کہتی ہو اجنبیوں پر بھروسہ کر لوں۔ نہ چندا! یہ مجھے سے نہیں ہوگا۔“ چچی نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ اچھا آپ میرے ساتھ چلیں گھر بار سب دیکھ لیں۔ دل مانے تو ہاں نہیں تو ناں۔“ تانیہ نے ہار نہیں مانی۔

☆.....☆.....☆

”اماں وہ مجھے مار دے گا“ سدرہ نے رات کے اس پہر ماں کے پیچھے چھپنا چاہا۔ ”کوئی بھی تو

نہیں ہے یہاں۔ اچھا سن ادھر میرے ساتھ ہی لیٹی رہ۔ نیند نہیں آرہی تو بتا دے ہم دونوں بہت ساری باتیں کریں۔“ ماں نے نرمی سے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ماں کا دل کٹ جاتا تھا اسے اس حالت میں دیکھ کر۔ کیسے ظالم تھے ظلم ڈھاتے تھکتے نہ تھے۔ نہ ان کے سورج غروب ہونے میں آرہے تھے۔ کبھی دھمکی آمیز فون کا لڑتو کبھی گھر پر پتھراؤ کیا جاتا۔

نکاح پر نکاح کرے گی بد کردار! دیکھنا تیری بیٹی کو کہیں چین نہیں لینے دوں گا۔ موت کی آرزو میں تڑپتی رہے گی۔“ ہر باریہ دھمکی دی جاتی اور ہر بار بیٹی سے سب چھپایا جاتا۔ جانے کس نے سدرہ کے رشتے کی بات کی خبر وہاں کر دی تھی؟

☆.....☆.....☆

”چچی آپ نے بتایا نہیں پھر!“ تانیہ نے دو دن جانے کیسے صبر کیا؟ چچا کے دکان پر جاتے ہی آگئی۔ سدرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کو اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“ دیور کی بیٹی کے سامنے بے بسی ظاہر کی۔ ”اس کی شادی نہیں کریں گی تو وہ یونہی ہر اسماں کرتا رہے گا۔“

”اسے کیسے پتہ چلا؟“ صفیہ دل کی بات زبان پر نہ لائی لیکن تانیہ نے چچی کا چہرہ پڑھ لیا

”پورا خاندان جانتا ہے کہ وہ پھر سے دھمکیاں دے رہا ہے۔ نکاح پر نکاح کی حد جاری کروائے گا یہی کہا ہے نا! کب تک اسے چھپا کر رکھیں گی کبھی تو رخصت کرنا ہی ہے۔“

☆.....☆.....☆

شعبان کی انا پرکاری ضرب لگی تھی۔ سدرہ گل کی زندگی کوئی اور آنے والا تھا۔ امیر الدین نے اس کی دوسری شادی اپنی بیوہ بہن کی بیٹی سے کروادی تھی۔ مکان ملکہ کے نام کر دینے کی شرط پر! خاندان میں شعبان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پھیل گئی تھیں۔ جمیلہ اپنی بیٹی کی زبان درازی سے بھی ان جان نہ تھی۔ مکان بھانجی کے نام کرنے پر ماموں تو دل و جان سے راضی تھا مامی البتہ دل ہی دل میں



خوب پیچ کھائے بیٹھی تھی۔ پہلے فیصلے کی ناکامی سے اس عجیب شرط پر مجبوراً چپ سادھنا پڑی۔ امیرالدین کو بھانجی کے اپنے ہونے پر بڑا مان جو تھا۔

مرد اپنی بلیک اینڈ وائٹ زندگی میں رنگ بھر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں! گھر کے لینڈ لائن نمبر پر اس کی دھمکیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ عورت دل بڑا کر کے سب نظر انداز کیے آگے بڑھ سکتی ہے تو مرد کیوں نہیں یہ گوارہ کرتا۔ کیسی انا ہوتی ہے جو سر عام رسوا کرنا تو قبول کر لیتی ہے لیکن عزت نہیں دے سکتی.....

☆.....☆.....☆

مار یہ اسے زبردستی لیے کینٹین چلی آئی۔ یونی کی یہ کینٹین گرنز کے لیے مختص تھی۔ خلاف توقع کینٹن خالی تھی۔ سوائے ایک کونے پر رکھی میز کرسیوں کے۔ وہاں کوئی تھا جو بے تابی سے سدرہ گل کا منتظر تھا.....

☆.....☆.....☆

گھر کیا تھا رنگوں اور پھولوں کی کہکشاں تھا۔ بیرونی گیٹ پر لپٹی بوگن ویلیا کی بہار گیٹ سے اندر عشق پیچاں کے خم و پیچ میں راہ سے بھٹکتی نظریں، سرخ و سفید گلاب کی بہار..... صفیہ تانیہ کے اصرار پر اس کے ساتھ جواد کے گھر چلی آئی تھی۔ رشتہ مناسب لگتا تو اگلے مرحلے پر منظور علی کے ساتھ آتی۔ ”میری رانیہ کے شوق ہیں یہ سب“ فریدہ نے آنے والوں کی ستائشی نظریں بھانپ لی تھیں۔ ”بی اے کے بعد فراغت کے وقت کی محنت ہے یہ!“ وہ پھر سے گویا ہوئی۔

”ماشاء اللہ! میرا جواد بھی کسی سے کم نہیں۔ آپ کی بچی کو تانیہ کی رخصتی پر دیکھا تھا۔ دھیمے مزاج کی بچی دل کو بھاگتی تبھی تانیہ سے گزارش کی۔“ فریدہ نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

”ارے آنٹی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ہماری سدرہ بہت قابل ہے تو جواد بھائی بھی کچھ کم نہیں“ تانیہ کی سسرال تھی۔ لہجے میں نرمی خود بخود در آئی۔ رانیہ نے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لان میں رکھی

میز پر ہی لگا دیے تھے۔ صفیہ وہاں سے واپسی پر مطمئن تھی اور تانیہ کی خوشی چچی کا دل جیتنے کی تھی۔

☆.....☆.....☆

گارڈز نے ماریہ کو گنز کے اشاروں سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اچانک افتاد سے ڈر کر باہر کو نکلی جہاں طالبات کا رش لگ گیا تھا۔ اندر کیا ہو رہا ہے؟ سب آنکھوں کے اشارے سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں۔

”تمہاری سہیلی باہر نہیں آئی۔ خیر تو ہے؟“ لانگ کرتے جینز میں ملبوس چیونگ گم چباتے، ایک لڑکی تیز تیز بولنے لگی۔

”مجھے کیا معلوم؟“ ماریہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی ظاہر کی۔

سب کے کان کینٹین کی دیواروں سے ہی لگ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”صدرہ کے ابا اور عثمان کے ساتھ آؤں گی۔ بھلے لوگ لگتے ہیں۔“ صفیہ نے ارادہ ظاہر کیا۔ بظاہر سب ٹھیک لگ رہا تھا۔ کس کا باطن کیسا ہے؟ اس کی خبر پہلے ہو جائے تو کوئی بیٹی دکھی نہ رہے۔ سبھی والدین بیٹیاں بیاہ کر سکون سے سوئیں۔ راتوں کو بے چین ہو کر رت جگے نہ جھیلیں اور اچھوں کی اچھائی سے کوئی نہ کھیلے

☆.....☆.....☆

کندھے پر لٹکے بیگ کی اسٹریپس مضبوطی سے پکڑے وہ سر اٹھائے کھڑی تھی اس کے سامنے جس نے اسے پیر کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔

”نکاح پر نکاح کرے گی؟ حد جاری کروادوں گا۔“ جواب میں مقابل کھڑی معمولی عورت

خاموش رہی۔

”بولنا وہاں بہتر جہاں قدر ملے!“ کچھ بھی کہے بنا، بے خوفی سے دیکھتی گل سے پہلی بار شعبان امیرالدین کو خوف محسوس ہوا۔ ”اسے مجھ سے ڈر کیوں نہیں لگا؟“ کینٹین سے باہر نکلتے لڑکیوں کے جگمگاتے پراچھتی نگاہ ڈالتے بے خوفی سے دیکھتی دو آنکھیں اسے ہراساں کر رہی تھیں۔

”کیا اس نے سر اٹھا کر جینا سیکھ لیا ہے؟“ سر جھٹک کر گاڑی میں بیٹھتے، سیالکوٹ کے راستے پر وہ صفیہ کو فون پر دھمکانا نہ بھولا۔

☆.....☆.....☆

گل پر اعتماد قدموں سے چلتی کینٹین سے باہر نکلی تو کسی کی طرف دیکھے بنا بس سٹاپ کی جانب مڑ گئی۔ اسے سالوں پہلے عثمان سے کیا وعدہ بھی نبھانا تھا۔ ڈر اسے اب بھی لگتا تھا۔ لیکن ظاہر نہیں کرنا..... ماریہ اس کے پیچھے لپکی۔ اسے بہت سارے سوال پوچھنے تھے اور گل کے پاس وقت کم تھا بہت سارے کام پنپنا تھے۔ جواد کے رشتے کے لیے سر جھکائے رضا مندی کا اظہار اپنی زندگی کا اگلا لائحہ عمل تشکیل دینا اور راتوں کو خوف زدہ ہو کر اٹھ جانا..... یہ سچ ہے اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کا خوف اس کے لیے آج بھی برے خواب جیسا تھا..... جس کی تعبیر خواب سے بھی بھیا نک..... یہ بھی سچ ہے کہ اس کی زندگی میں اب شعبان امیرالدین کی حیثیت بھیا نک خواب سے زیادہ نہ..... تھی بار کنگ ڈوگز سیلڈم بائیٹ میٹرک میں نہ سمجھ آنے والا ایڈیم اب حالات اسے سمجھا رہے تھے مکمل تشریح کے ساتھ

☆.....☆.....☆

سیالکوٹ گھر پہنچتے ہی شعبان امیرالدین کا غصہ سوا ہو چکا تھا۔ صفیہ نے پہلی بار اس کی دھمکیوں کے جواب میں کال منقطع کرنے میں پہل کی تھی۔ اس سے پہلے ہمیشہ اسی نے ڈر ا دھمکا کر فون بند کیا۔ آج ایسا کیا ہوا کہ پہلے بیٹی اور پھر ماں نے خاموش رد عمل بنا ڈرے بنا سہے

ایسا کیا ہو گیا تھا پچھلے کچھ سالوں میں۔ کیا عورت بھی مرد کو سر اٹھا کر دیکھ سکتی ہے..... نادان



بھول گیا تھا کہ جسے وہ پیر کی جوتی سمجھتا رہا وہی سر پر برسے جا رہی تھی۔ ”پاتال کی تہہ میں بھی سکون نہیں لینے دوں گا!“ شعبان نے غصے میں مٹھیاں بھینچیں۔

☆.....☆.....☆

دادا کی سدرہ اور نانا کی گل کا نصیب اب جواد سے جڑنے جا رہا تھا۔ بظاہر پرسکون انداز لیے اندرونی خدشات میں گھری سدرہ گل جذباتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ گھر میں ادبی ماحول تو تھا ہی، اس کا رجحان لکھنے کی جانب مائل ہو گیا۔ لکھا اور بہت خوب لکھا۔ پہلے ڈائریاں بھریں پھر اس کی لکھت مختلف ویب سائٹس کی زینت بننے لگی۔ شعبان نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ہر بار اس کی تحریر شائع ہونے پر وہ انھیں ڈرانا دھمکانا نہ بھولتا۔ تو صفیہ اور سدرہ گل بھی اس کے ڈراوؤں کے جواب میں فون کر یڈل پر پٹخ کر خاموش رد عمل دینا نہ بھولتیں۔ سدرہ کا ایم اے کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ اُس کا ارادہ اپنی یونیورسٹی سے ایم فل کرنے کا تھا کہ گھر میں اُس کی شادی کی بات نکل پڑی۔

☆.....☆.....☆

امتحانات سے فراغت ملی تو گھر میں اس کی رخصتی کے شادیاں بننے لگے۔ بہت سے خدشات میں گھری صفیہ اور منظور علی کی دعاؤں کے حصار میں وہ وداع بھی ہو گئی۔ زندگی میں نئے ابواب کا اضافہ ہونے جا رہا تھا۔ اگلا پل کیسا ہوگا؟ کون جانے؟

☆.....☆.....☆

دلہن بنی وہ ہونقوں کی طرح کمرے میں چکراتی رانیہ کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی الماری تو کبھی بیڈ کے سائیڈ پر درازیں کھول کر جانے کون سا خزانہ تلاش کر رہی تھی جو مل کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ جواد دروازہ کمرے میں آیا تو بہن کو وہاں دیکھ کر ٹپٹا گیا۔

”آپ تو میرے لیے خاک اور خون لائے تھے!“ کمر پر ہاتھ ٹکائے، دلہا بنے بھائی کو کڑے

تیوروں سے دیکھتی اس وقت بھائی کے ارمانوں کا خون خاک میں ملا رہی تھی۔

”ابھی نہیں لایا۔“ گھبراتے ہوئے لہجے میں جواب دیا گیا۔

بیٹھے بیٹھے اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہیں گھڑی بنی تکیے سے ٹیک لگائے آنکھیں موند لیں۔

”لو جی تمھاری دلہن کو تو نیند ہی اتنی آرہی ہے۔ آؤ ہم تب تک کارڈز ہی کھیل لیتے

ہیں۔“ کمرے کا دروازہ بند ہونے سے پہلے جو آخری بات سدرہ گل نے سنی وہ یہی تھی۔ کمرے میں وہ

اب اکیلی تھی۔ ایسا ایک عرصے تک ہونے جا رہا تھا۔ رانیہ اپنے سے ایک سال بڑے بھائی کے بنا ایک

پل نہ رہتی۔ کبھی جو وہ دروازہ مقفل کرتا تو وقت کا لحاظ کیے بنا دروازہ پیٹ ڈالتی۔ بھائی بہن کے غصے اور

متوقع ہنگامے سے بچنے کو دروازہ کھلا ہی رکھتا۔

☆.....☆.....☆

”آپ جاب پر نہیں جا رہے؟“ شادی کے کچھ روز بعد بھی جوادی کی چھٹیاں ختم نہ ہوئیں تو جھکتے

ہوئے پوچھ ہی لیا۔

”نہیں“ یک لفظی جواب آیا۔

”اتنی اچھی جاب ہے، زیادہ چھٹیاں ہونے پر کوئی مسئلہ نہ بن جائے“ اسے کسی طرح تو یاد دلانا

ہی تھا۔

”آفس بوائے کی جاب کو اچھا کہتی ہو! ڈیر وائف! کس دنیا میں رہتی ہو؟“ جوادی کے انکشاف

پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”تانیہ باجی تو کہہ رہی تھیں آپ بڑی اچھی پوسٹ پر ہیں۔“ اسے بری طرح صدمہ ہوا

تھا۔ پہلے شعبان اور اب جوادی..... اس کے جذبات کے ساتھ یوں کھیل کھیلا جاتا رہے گا۔

”رشتہ کرواتے ہوئے تھوڑا بہت جھوٹ تو بولا ہی جاتا ہے۔ تم نے نہیں بولا ہوگا کوئی

جھوٹ!“ جواد جانے کیوں ترش ہوا۔

”ہم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ سب سچ بتا دیا تھا۔“

”یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہارا پہلا شوہر نکاح پر نکاح کرنے پر زنا کی حد لگوانے کی دھمکیاں دے رہا ہے.....“ سدرہ گل کے پاس جواد کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا.....

☆.....☆.....☆

”یہ سب کیا ہے؟“ سلیم صاحب دفتر سے گھر لوٹے تو ہاتھ میں کچھ پمفلٹس تھے جنہیں جواد کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے برس پڑے۔

”اس گھر کی بہو کی ناکام شادی کے اثرات اب کالونی کے در و دیوار پر بھی دکھیں گے۔“ پمفلٹس پر سدرہ کی تصاویر تھیں۔ شعبان امیر الدین کی جانب سے ان پر نکاح پر نکاح کے الزام کے ساتھ..... نکاح کے وقت لی گئی سدرہ گل تصویر ایڈیٹنگ کے بعد نمایاں کی گئی تھی۔ شعبان امیر الدین اس کی زندگی اجیرن کرنے یہاں بھی آ گیا تھا۔

”زمین تنگ کر دوں گا۔“ اس کی آنکھوں میں ہر اس کی کیفیت نمایاں تھی۔

☆.....☆.....☆

”میں امی کے جانا چاہتی ہوں۔“

”امی سے پوچھ لو!“

اگلی صبح اس نے جواد سے کہا تو اس نے خود کو آرام سے بری الذمہ کیا۔ ماں سے یہ بات کہہ کر کچھ دن پہلے کی دلہن کو پریشانی سے بچا سکتا تھا۔ ایک دن قبل گھر میں جو ہوا تھا اس کے بعد سے سدرہ سے کسی نے کوئی بات نہ کی ہاں مگر فریدہ، سلیم کی ملامتی اور رانیہ کی چھبتی نظروں میں گھری رہی۔ تنگ آ کر سارے کام نبٹائے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں آنے والے وقت کا خوف اس کا منتظر تھا۔ رات بھر کی سراسیمگی



کے بعد صبح اس نے مجازی خدا سے کہا تو اس نے ماں کی اجازت سے اسے چھوڑ کر آنا مشروط کر دیا۔  
 ”میرا بچہ اس مطلقہ کے چکر میں پھنس گیا۔“ فریدہ کی آواز اس کے کمرے سے باہر آئی تو اُس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

”میں خود تو یہاں نہیں آئی۔“ اسے تانیہ کا آنا جانا یاد آیا۔ کیسے اُس نے اُن کی چوکھٹ کا پیچھا لے لیا تھا۔ کیسے اس نے صفیہ کے منہ سے ہاں کہلو کر ہی دم لیا تھا۔  
 ”دیکھنا میں اپنے بچے کی دوسری شادی کرواؤں گی۔“ جمعہ جمعہ آٹھ دن سدرہ گل کو یہاں ہونے کو آئے تھے کہ جوادی کی دوسری شادی کا ذکر بھی شروع ہو گیا۔  
 ”اللہ! اب میرے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے؟“ اس نے مایوسی سے سوچا اور واپس کمرے میں چلی گئی۔ ماں سے دکھ کہنے کا ارادہ بھی ملتوی ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اک جبر مسلسل ہے یہ آزار مسلسل  
 حالات کا یہ گھاؤ ہے اک بار مسلسل  
 احساس کی وادی میں نہ گل ہے نہ گلستاں  
 ہیں فکر و نظر برسرِ پیکار مسلسل  
 حالات کی یہ جنگ کہ درپیش ہے مجھ کو  
 ہر گام پہ ہر موڑ پہ اک کار مسلسل  
 جو بات کبھی خود سے بھی ہم نے نہ کہی تھی  
 اب اس کا بھی ہے شہر میں پرچار مسلسل

وہ برف سے لہجے میں ہوئی تلخ سی باتیں

گفتار کے ملبوس میں تکرار مسلسل

الفاظ کی تندہ نے کیا روح کو چھلنی

اقرار کے پردے میں ہے انکار مسلسل

اغراض کے پردوں میں چھپے سارے تعلق

دھوکہ ہے محبت کا یہ اظہار مسلسل

وہ کرب کے لمحے ہیں کہ تکلیف سی تکلیف

دل درد کی شدت سے ہے بیزار مسلسل

یادوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہیں مسلط

لٹکی ہے مرے سر پہ یہ تلوار مسلسل

بس عیش و مسرت میں جو مدہوش تھا کبھی

سنتے ہیں کہ اب غم میں ہے بیدار مسلسل

آج پھر اس کا دل چھلنی کیا گیا تھا۔ قرطاس پر کہے جانے والے نوحے آج پھر ڈائری کا سینہ

چاک کیے دے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”میں آپا کو لے جانے آیا ہوں۔ عاطف کی روانگی ہے آج رات۔“ ڈرائیو روم کے وسط میں

رکھے براؤن پوشش والے صوفے پر پر تکلف انداز میں بیٹھے عثمان نے جوس کا گلاس خالی کر کے سامنے

دھری میز پر آہستگی سے رکھ کر مدعا بیان کیا۔

”ہاں بھئی لے جاؤ! یہی وقت میسر ہے پھر جانے کب بہن بھائی ایک دوسرے سے ملیں؟“ فریدہ

خوش دلی سے بولی تو سدرہ گل کو ایک روز پہلے جوادی شادی کروانے کی بات یاد آ گئی۔

چھوٹے سے بیگ میں ضرورت کی اشیاء لیے وہ اپنے سرخ اینٹوں والے آنگن میں چلی آئی۔ جہاں گھر کے مکینوں سمیت شام کے وقت پانی کے چھڑکاؤ کے بعد اٹھنے والی بھینی بھینی مہک اس کے استقبال کو بے تاب تھی۔



میکے آتے ہوئے وہ رکشے میں بیٹھی، محلے کے در و دیوار بھی دیکھتی آئی تھی۔ جہاں شعبان امیر الدین کے لگائے گئے الزامات چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ زمینی خدا کی جانب سے اس پر عرصہ حیات تنگ کیے جانے کی جنگ چھیڑ دی گئی تھی۔

منظور علی اسے پہلے سے بھی کم زور دکھے۔ صفیہ بھی بیٹی سے نظریں چرائے ہوئے تھیں۔ رات بارہ بجے کے بعد عاطف کی فلائیٹ تھی۔ اسے بہت ساری دعاؤں کے ساتھ روانہ کیا تو وہ صبح سے خود پر ضبط کیے تھی، صحن میں پچھی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ کچھ وقت اسے اپنے ساتھ رہنا تھا۔

”شعبان بھائی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ آپ! آپ کا یہ بھائی آج بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہے خود کو اکیلا مت سمجھنا۔“ عثمان برابر میں آ کر بیٹھ گیا اور تسلی کے انداز میں گویا ہوا۔

”مجھے ہی کیوں آزمائش میں ڈالا گیا!“ اس نے بھائی کی جانب دیکھے بنا کہا تو دو سال چھوٹا بھائی بھی تڑپ کر رہ گیا۔

”ابراہیم خلیل اللہ نے شکوہ کیا کہ مجھے آگ میں کیوں ڈالا گیا؟ اسماعیل علیہ السلام کی قربانی مانگی گئی تو کیا اللہ کے دوست نے سوال کیا کہ یا اللہ! میں ہی کیوں آزمائش میں ڈالا گیا؟“

”وہ نبی تھے، برگزیدہ بندے، ہم ان کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”ان کی سنت تو اپنا ہی سکتے ہیں نا!“ عثمان کا کہنا اسے لا جواب کر گیا گردن موڑ کر اسے



دیکھا۔ آنکھوں میں نمکین پانیوں کا جزیرہ بہ جانے کو بے قرار نظر آیا۔  
 ”بھائی ہے میرا! میرا ماں جا یہ!“ اس نے سوچا اور آنسوؤں کو چہرہ بھگونے دیا۔

☆.....☆.....☆

”یہ گھر بیٹھ گیا ہے تو تمھاری اتنی ڈگریاں کس دن کام آئیں گی؟ اسکول میں پڑھاؤ اور اپنا خرچ اٹھاؤ! میاں بیوی کا پیسہ کوئی الگ الگ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ وہ نوکری کرے یا تم! بات ایک ہی ہے۔ اب سلیم صاحب نے ٹھیکہ تو لیا نہیں کہ بیٹے کے ساتھ ساتھ بہو اور ان کے آنے والے بچے کو بھی پالیں۔“ فریدہ کی زبان زہر افشانی پر آئی تو سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر گل کو صاف باہر کا رستہ دکھا دیا۔ وہ خود یہاں نہیں آئی تھی لیکن قدم قدم پر اسے بتایا جا رہا تھا کہ وہ اس گھر میں ان چاہا فرد ہے جس کو یہاں اس گھر کے ایک نکھٹو کا بوجھ سونپ دیا گیا تھا۔ پچھلے کئی روز سے اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ میسکے میں تھی تو صفیہ لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر چیک اپ کروا لائی تھی۔ سسرال میں کسی سے تو کہنا تھا۔ ساس سے کہا تو اگلے کئی سالوں کا نقشہ کھینچ کر دکھا دیا کہ لوبی بی یہ ہے باہر کا رستہ نکلو، کماؤ اور ہمارے ناکارہ کو بھی پالو!

☆.....☆.....☆

بیل ہونے پر سلیم صاحب نے گیٹ کھولا تو ذلت کی نئی صورت ان کی منتظر تھی۔

”آپ کے بیٹے جواد سلیم نے شعبان امیر الدین کی بیوی سدرہ گل سے نکاح پر نکاح کیا ہے۔ آپ کے بیٹے جواد سلیم اور شعبان امیر الدین کی بیوی سدرہ گل کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔“ انسپکٹر نے جواد اور سدرہ گل کے گرفتاری وارنٹ سلیم صاحب کے آگے کیے۔ وہ گرفتاری وارنٹ سے آگے کچھ سن نہ پائے

”اب یہ دن بھی دیکھنا ہوں گے!“ غصے شدید لہر رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ گل کی نئی نئی جاب تھی۔ وہ نکلنے لگی کہ یہ سب ہو گیا۔

”میں اپنے بیٹے کے لیے تو بھاگ دوڑ کر لوں گا لیکن تم وہیں سڑتی رہنا۔ مفت کے بوجھ میں نہیں اٹھانے کا۔“ لیڈی کانٹیبیل اسے باہر لے کر آئی تو سر نے اسے اس کی اہمیت جتا دی۔

”اپنے باپ سے کہنا ذلت کی پوٹ اپنے پاس رکھے۔ اس گھر کے دروازے اب تم پر بند ہیں۔“ فریدہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ کوئی کیسے اتنا سفاک ہو سکتا ہے؟ یہ بات اسے آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ پہلے خالہ خالو کے رویے اور شعبان کی نام نہاد انا اور اب یہ..... جو اسے اپنی مرضی سے اپنی سہولت کے لیے اس گھر میں لے کر آئے تھے اب مشکل وقت کے گہرے سائے بڑھتے دیکھ کر تنہا کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

بدبودار کوٹھڑی کے ایک کونے میں وہ بازوؤں کے ہالے میں چہرہ دیے بیٹھی تھی کہ آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا۔ کلف لگے بے شکن سوٹ میں وہ ہی تھا۔ شعبان امیر الدین..... زمین پر اکڑا کڑ کر چلنے والا زمینی خدا.....

”دیکھ لیا میری طاقت کا مظاہرہ! کیسے ایک جھٹکے میں عزت سے ذلت کی جانب موڑ دیا!“ لہجے کا تقاخر، گردن میں آیا سریا

”اللہ حساب لے گا!“ گل اس کے مقابل کھڑی ہوئی اس کی آنکھوں میں بے خونی سے دیکھ کر کہا۔ زوردار قہقہہ لگایا اور باہر نکل گیا ”رسی جل گئی بل نہ گیا۔“

☆.....☆.....☆

عثمان نے سلمان کے بھائی کی مدد سے گل کی ضمانت کروالی تھی لیکن جو ذلت اور رسوائی سرعام جھیلی اس کا کفارہ کیسے ہوگا؟ اس کا جواب نہ بہن کے پاس تھا نہ دل جوئی کرنے والے بھائی کے پاس..... عجیب سی خاموشی بیچ میں در آئی تھی۔ کاش ان سب کی زندگیوں میں شعبان امیر الدین نام کا

زمینی خدا نہ آیا ہوتا..... کاش گل کی شادی اس کے ساتھ نہ ہوئی ہوتی..... اتنے کاش تھے اور سب ہی لا جواب..... لوگوں کی باتوں سے بچنے کے لیے عثمان بوڑھے ماں باپ اور بہن کو لیے دور پرے کے علاقے میں شفٹ ہو گیا۔ گھر کی لوکیشن ایسی تھی کہ منظور علی نے جنرل اسٹور والے کام کا پھر سے آغاز کر دیا تھا۔ اکیلے بیٹے پر بوجھ بننا گوارہ نہ تھا۔ عاطف بھی ابھی پڑھ رہا تھا۔ اس کے اخراجات اور بہت ساری ذمہ داریاں..... عثمان اکیلا کیا سنبھالتا۔

☆.....☆.....☆

بیٹی کی پیدائش پر بھی وہاں سے کوئی نہ آیا۔ ناچار گل کو خود ہی سوا مہینہ پورا ہونے پر سسرال آنا پڑا۔ عثمان لاکھ کہے وہ اس پر بوجھ نہیں، کب تک ایسے پڑی رہتی۔ پہلے ہی اس پر گھر نہ بسانے والی عورت کی چھاپ لگ گئی تھی۔ جواد کے ساتھ کسی بھی طرح نبھا کرنا ہی تھا۔ فردنا گوار کی طرح اسے گھر میں آنے تو دیا گیا تھا کیا کرتے عزت دار لوگ تھے۔ بہو اور پوتی کو نکال بھی نہیں سکتے تھے۔ کہاں وہ بڑے بڑے بول..... عثمان اسے ہر مہینے کچھ رقم دے دیا کرتا جس سے وہ اپنی بچی کی چھوٹی بڑی ضروریات پوری کرتی۔ جواد تو پہلے ہی لیے دیے رہتا تھا۔ گرفتاری والے واقعے کے بعد سے بیوی کے ساتھ اور بھی محتاط رویہ اپنایا تھا۔ فطری جذبات سے مغلوب بیٹی کو گود میں اٹھاتا تو فریدہ اور رانیہ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھالیتیں۔ فریدہ کا کہنا تھا ماں جیسی ہی نکلے گی بہتر ہے لاڈ پیار نہ ہی اٹھائے جائیں۔ رشتوں میں لا تعلقی در آئے تو چور دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ جواد نے بھی اپنے لیے ایسا ہی ایک چور دروازہ کھول لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”آپ ابھی تک سوئی نہیں!“ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آئی اور ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مہک نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ یہاں کھڑے کتنا ہی وقت بیت گیا تھا۔ گلاس وال سے نظر آتا



اندھیرے میں ڈوبالان کا منظر، لیکن وہ تو کہیں اور ہی گم تھی.....  
 یاد کی جھیل میں پھینکا تو ہے کنکر تو نے  
 اب وہی دیکھ جو دیکھے نہیں منظر تو نے

☆.....☆.....☆

ہاتھ کی لکیروں میں!

ہاتھ کی لکیروں میں  
 قسمیں مقید ہیں  
 ملنے اور پچھڑنے کی  
 مدتیں مقید ہیں  
 جو کبھی ملا نہیں  
 اس کا ساتھ لکھا ہے  
 جس کو اپنے سپنوں میں  
 ان اداس آنکھوں نے  
 آج تک نہیں دیکھا  
 اس کا ہاتھ لکھا ہے  
 میرا مشورہ تو ہے  
 ہاتھ کی لکیروں کو  
 دیکھنا ہی چھوڑ دو

تھام کر حقیقتیں  
 خیال و خواب کے یہ کھیل  
 کھیلنا ہی چھوڑ دو  
 ہاتھ کی لکیروں میں  
 زرد تر خزاؤں کی  
 آہٹیں مقید ہیں  
 گرم تر ہواؤں کی  
 سازشیں مقید ہیں  
 پرفریب لمحوں کی  
 کاوشیں مقید ہیں  
 بھول جاؤ یہ کہ ان میں  
 قسمیں مقید ہیں

اسے شک تو ہوا تھا آج جواد کو بہت دھیمے لہجے میں کسی سے بات کرتے سن بھی لیا تھا۔ قسمت اس سے اب کس روپ میں ملتی؟ کچھ خبر نہ تھی، نہ کوئی چاہ..... غصہ کرتی، روتی شکوہ کرتی کیا کرتی جس سے اس کا غم ہلکا ہوتا..... ڈائری کے کورے ورق اس کا نوحہ سننے کو بے تاب تھے۔ کوئی تو تھا جو اس کی سنتا تھا..... کوئی تو تھا جسے اپنا غم کہہ سکتی تھی۔ جواد دوسری شادی کر لیتا وہ گوارہ کر لیتی لیکن حرام تعلق میں بندھنا کیسے قبول کر لیا اس مرد نے جس پر کوئی ذمہ داری نہیں نہ وہ اس کی اہلیت رکھتا ہے۔ نفس کے گھوڑے پر سوار اپنی خواہشات کے پیچھے اتنا اندھا ہونا..... کیا کوئی پیمانہ نہیں جس سے صحیح، غلط، ثواب، گناہ، حلال،

حرام کی کی تعین ہو سکے؟ ہے نا! اس کا دل کہتا۔ وہ بھی تو شوہر کی بے توجہی سہہ رہی ہے۔ اس کا بھی نفس اسے برائی کی جانب مائل کرتا ہے لیکن حد پار کرنے سے کیا ہوگا؟ وقتی لذت اور دنیا و آخرت کی ذلت ہمیشہ کا مقدر.....

☆.....☆.....☆

”میرے آگے زبان چلانے کی ہمت کیسے کی؟ نا فرمان عورت!“ شعبان کی آواز نے کمرے کی دہلیز پار کی۔

”چلاؤں گی زبان بھی اور گھر سے بھی نکالوں گی تم سب کو! مجھے گل سمجھنے کی غلطی نہ کرنا میں ملکہ ہوں ملکہ! حکومت کرنے اور حکم چلانے کی عادی“ ملکہ مجازی خدا سے بلند آواز میں چلائی۔ امیرالدین کو دنیا سے رخصت ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ عادت سے مجبور مرد نے عورت کو اس کی اوقات یاد دلا کر اصلاح چاہی تو پیر کی جوتی ہی اس پر برس پڑی۔ گھر ملکہ کے نام کرنا کہیں غلط فیصلہ نہ ثابت ہو۔ رضیہ کا دل ہولا۔ امیرالدین کی مرضی سے یہ کام ہوا تھا۔ ماموں کی زندگی میں کبھی اس نے یہ روپ ظاہر نہ کیا۔ اب ماموں منوں مٹی تلے دفن ہوئے تو اپنا اصل دکھانے میں دیر نہ کی۔ مرد سمجھتا ہے عورت کو ذلیل و رسوا کرے گا تو ہی اوقات میں رہے گی۔ بھول جاتا ہے کہ عورت جب مرد کو نیچا دکھانے کی ٹھان لے تو کیا نہیں کر گزرتی؟ ہر عورت سدرہ گل نہیں ہوتی..... اور سدرہ گل ہر عورت بھی نہیں ہوتی.....

☆.....☆.....☆

”وہ..... مم..... میں باجی سے بات کر رہی تھی۔“ گھبرا کر نند کا نام لیا۔

”ضرور میری برائیاں کی جارہی ہوں گی۔“ عالیہ نے ساس کے ہاتھ سے فون چھینا۔

”نہ یہ ہوگا نہ کسی سے میری برائی ہوگی۔ کھلاؤ! پلاؤ! برداشت کرو! پھر بھی یہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حد ہے!“ بہو پر پھر سے ڈپریشن کا اٹیک ہوا تھا کسی پر تو نکالنا ہی تھا۔ اسے ڈر رہتا تھا کہ کہیں راجدھانی چھن



نہ جائے۔ جس کی وجہ سے ڈرتی تھی وہ بھی تو اب خود مختار ہو گئی تھی..... بہت پیسے والی..... آشیانہ مسکن کی زندگی..... وہاں بسیرہ کرنے والی بے جان روحوں کی زندگی.....

☆.....☆.....☆

سر پر ہمہ وقت سائے کی طرح سوار ماں بہن کیسے اس سب سے انجان ہوں گے؟ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ جو اد کی زندگی سے کسی طرح اسے مائنس کر دیا جائے۔

”میری بھابھی سے بات کر رہے ہیں نا!“ لان میں گرمی دھوپ کی پرواہ کیے بنا وہ فون کان سے لگائے بہت آہستگی سے کسی سے بات کر رہا تھا کہ رانیہ نے پیچھے سے آکر آواز لگائی۔ دوسری جانب جانے کیا ہوا کہ کال منقطع ہو گئی۔

”آ..... ہاں..... نہیں تو..... میں اپنے دوست سے بات کر رہا ہوں۔“ وہ ٹپٹا گیا۔

”ایسا کون سا دوست جس کی خاطر گرمی بھی برداشت کی جا رہی ہے!“ رانیہ نے کہا اور بے ہنگم انداز میں قہقہے لگانے لگی۔ بھائی کی زندگی میں سدرہ کی شراکت اسے کبھی نہ بھائی تھی۔

”سانولی سی سدرہ میں تھا ہی کیا؟ سوائے چند ڈگریوں کے..... میں بھی تو گریجویٹ ہوں.....

مجھے تو کوئی قدر دان نہیں ملا۔ اسے دیکھو طلاق یافتہ ہوتے ہوئے بھی میرے کنوارے بھائی کے ساتھ بندھ گئی۔ ہونہہ.....“ کلس کر رہ جاتی لیکن ماں کی خاطر برداشت کر رہی تھی نا کارہ بھائی کو پالنے کا

ذریعہ..... سدرہ نے محنت اور لگن سے یہ سب حاصل کیا تھا کوئی دو چار پلوں کی بات نہیں کئی سالوں کی لگن شامل تھی اس میں اور لوگ لمحوں میں حیثیت دو کوڑی کی کر دیتے ہیں۔ ایسوں کو محنت کرنا مشکل لگے

تو آسانی سے منفی رویے اپنا کر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا سکون برباد کرتے ہیں یہی سب وہ بھائی بھابھی کی زندگی میں کر رہی تھی۔ رات کے جس بھی پہر اسے ڈپریشن ہوتا ان کے کمرے کے بیچوں بیچ

دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیتی۔ جو اد گھبرا کر اٹھتا اور بہن کی دل جوئی میں لگ جاتا۔ اس سب میں

سدرہ کہاں تھی..... شاید کہیں بھی نہیں..... اب جواد کی نئی مصروفیت اسے ہر پل بیوی اور بچی سے دور کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جواد کمرے کی میز پر موبائل بھول گیا تھا۔ سائلنٹ موبائل کی واٹریشن ہونے پر سدرہ نے سوئی ہوئی نور کو احتیاط سے لٹایا مبادا اٹھ نہ جائے اور پھر سے کام رک جائے۔ 'شانی از کالنگ' 'میں بیوی ہوں جواد کی مجھے پورا حق ہے یہ سب جاننے اور اس قصے کو ختم کرنے کا.....' اس سوچ کے ساتھ اس نے کال ریسیو کر لی۔

"آپ کون؟" کال کرنے والی شاید جواد کے شادی شدہ ہونے سے لاعلم تھی۔ "جواد سلیم کی بیوی....." دوسری جانب یہ سنتے ہی کال منقطع کر دی گئی۔ سدرہ فون واپس رکھنے سے پہلے کال ہسٹری ڈیلیٹ کرنا نہ بھولی۔ "بے چاری کو جانے کیا آس دلائی ہوگی؟" اسے دکھ ہوا۔

☆.....☆.....☆

کچھ یاد آنے پر وہ بہت جلدی میں اندر آیا۔ فون میز پر تھا اور سدرہ کمرے میں نہیں تھی۔ بہت سارے میسجز اس کے انتظار میں تھے۔ شانی اسے فراڈ دھوکے باز اور بہت سی ناقابل اشاعت گالیوں سے نواز کر ہر جگہ بلاک کر چکی تھی۔ حرام تعلق پنپتے نہیں..... "تم نے میرا موبائل استعمال کیا؟" شدید غصے کے زیر اثر اب وہ بیوی کے سر پر کھڑا جرح کر رہا تھا۔ "جی" ایک لفظی جواب اسے تلملا گیا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی میری جاسوسی کرتے ہوئے....."

"آپ کو شرم نہیں آئی حرام تعلق بناتے ہوئے....." سدرہ کا اعتماد قابل دید تھا۔

”تمھاری وجہ سے ہی یہ حرام تعلق بنا.....“

”اپنے گناہوں کی گٹھڑی دوسرے کے سر لا کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے.....“

”زبان چلاتی ہے منحوس.....“ فریدہ جانے کب سے کان لگائے سن رہی تھی کچن میں آ کر واویلا شروع کر دیا۔ اسی دن کی منتظر تھی جب جواد کا غصہ سوا ہو کب اسے باہر نکالے۔ دنیا میں بے وقوف عورتوں کی کمی نہیں ایک چھوڑ کئی مل جائیں گی جو جواد کے نکلے پن کو اپنی کمائی سے ڈھانپ دیں۔ کیسی گھٹیا سوچ اور دہرے معیار کے لوگ ہوتے ہیں۔ رانیہ کی اب تک شادی نہ ہونے کی وجہ ہی یہی تھی کہ انھیں کوئی مناسب شخص نہیں مل رہا تھا۔ اچھی مالی حیثیت اور والدین اور بہن بھائیوں کی ذمہ داریوں سے آزادان کے نزدیک ’مناسب شخص‘ کی تعریف میں آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”آپ اب کچھ بھی کہیں میں یہ سب برداشت نہیں کروں گی چاہے کچھ بھی ہو.....“ سدرہ کے منہ سے اتنا سننا تھا کہ جواد کا ہاتھ اٹھ گیا۔

”بیچ..... بد ذات..... میری ماں سے زبان چلاتے شرم نہیں آئی؟ یہی تربیت کی ہے تیری ماں نے.....“ وہ جواد نہیں تھا اس کے روپ میں کوئی اور ہی تھا جو صرف بیٹا تھا..... شوہر اور ایک بچی کا باپ نہیں۔ ساری رات روتے سسکتے گزری۔ ”اللہ اب بھی میں ہی قصور وار..... اپنے گناہوں کا گٹھڑ دوسرے کے سر کیسے لا دے سکتا ہے کوئی؟“

آسمان کی جانب  
اس طرح سے مت دیکھو  
آفتیں جب آنی ہوں  
ٹوٹنا ستاروں کا



ریت اس نگر کی ہے  
تم ابھی نئے ہونا!  
اس لیے پریشاں ہو

☆.....☆.....☆

ایک بار سچ سامنے آنے پر جواد میں ڈھٹائی آگئی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں پڑے دو نفوس سے پہلے بھی کچھ لینا دینا نہ تھا اب تو ان کے سامنے نئی نئی دوستیاں بنالی تھیں۔  
”مرد کے پاس ایک سو ایک حربے ہوتے ہیں نفس کے تلذذ کو..... ایسے میں عورت کیا کرے؟“ کلس کر سوچتی تو نفس گناہ پر مائل کرتا:  
”تم بھی وہی کرو! کیا پڑی ہے سمجھوتہ کرتی رہو!“

”بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ دلیل سے نفس اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا  
گھر میں جواد کی دوسری شادی کی باتیں پہلے تو ڈھکے چھپے ہوتی تھیں اب کھلم کھلا اعلان ہوتا۔ جواد کو تصویریں دکھائی جاتیں۔ وہ ہوں ہاں کہتا اور کمرے میں بند ہو جاتا۔  
ایسے اذیت بھرے لمحات میں عثمان کی شادی کے دن قریب آئے تو سب بھول بھال بھائی کی خوشی میں شریک ہونے وہاں چلی آئی جہاں اس کے غم گسار اس کے منتظر تھے۔ وہ جودکھ کے ساتھی تھے ان کے سکھ میں کیوں پیچھے رہتی۔

☆.....☆.....☆

عاطف کی کمی سب نے محسوس کی۔ وڈیو کالز پر بات ہو جاتی لیکن درمیان میں حائل سکرین سے کہاں وہ بات بنتی ہے۔ عثمان کی پوسٹنگ اسلام آباد میں ہو گئی تھی شادی کے بعد وہ اماں ابا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور صفیہ منظور علی اس پر راضی نہ تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کامیکہ دور ہو جاتا، یہ کیسے گوارہ

کرتے۔ پہلے والے حالات رہے نہیں تھے کہ شعبان کی طرف سے خطرہ رہتا۔ عثمان کے جانے کے بعد وہ اپنے اسی سرخ اینٹوں سے بنے آنگن میں بسیرا کرنا چاہتے تھے۔ فروا منظور علی کے بچپن کے دوست کی بیٹی تھی۔ عثمان کی ہی فیلڈ سے وابستہ۔ زندگی میں ایک عرصے بعد سکون دُر آیا تھا۔ شادی کے ہنگامے نور کی قلقاریاں گل کو ماضی کے سیاہ باب بھلانے میں مددگار ثابت ہوئے تھے۔ دن کب چڑھتا کب رات ہوتی چھوٹی چھوٹی مصروفیات میں کچھ پتہ نہ چلتا۔ ایک طرح سے گل کو یہ مصروفیت بھلی ہی لگتی۔ جواد اور اس کے گھر والے عثمان کی شادی میں تو کیا ہی شرکت کرتے، یہ کہہ کر ناراضی لیے رہے کہ انھیں صحیح سے دعوت نہیں دی گئی، یہ صحیح سے کیا ہوتا ہے کوئی نہیں جان پایا۔ لیکن گل کے سامنے اس لیے تذکرہ نہ کرتے کہ کہیں اس کا دل برانہ ہو۔ ولیمے سے اگلے دن عثمان اور فروا بھی چلے گئے تو گل سسرال اور صفیہ منظور علی اپنے پرانے محلے میں چلے آئے۔



سسرال میں ایک نئی خبر اُس کی منتظر تھی۔ گھر میں جواد کی دوسری شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ ”عثمان کی شادی میں شرکت نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی۔“ اسے ان سب کی ذہنیت پر افسوس ہوا۔ فریدہ کا کہنا تھا اب اسے بوڑھے ماں باپ کے پاس چلے جانا چاہیے ان کے بیٹے کی بلیک اینڈ وائٹ زندگی رنگین کرنے والی آنے والی تھی۔



## آخری قسط نمبر 3

سراں میں ایک نئی خبر اس کے استقبال کو تیار تھی۔ گھر میں جوادی کی دوسری شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ ”عثمان کی شادی میں شرکت نہ کرنے کی اصل وجہ یہ تھی۔“ اسے ان سب کی ذہنیت پر افسوس ہوا۔ فریدہ کا کہنا تھا اب اسے بوڑھے ماں باپ کے پاس چلے جانا چاہیے ان کے بیٹے کی بلیک اینڈ وائٹ زندگی رنگین کرنے والی اب آرہی تھی۔

☆.....☆.....☆

تم ابھی نئے ہونا!

ڈائری میں لکھا مرغوب حسین طاہر کا یہ کلام اسے بے طرح یاد آ رہا تھا۔ ہر بار اس کی سادگی سے کھیلا جاتا رہا ہے۔ ہر بار وہ خاموش نظروں سے آسمان کو دیکھا کرتی۔

آسمان کی جانب اس طرح سے مت دیکھو

کھڑکی کے پردے ایک طرف کیے اسے پورے چاند کو دیکھتے کتنے ہی پل بیت گئے تھے۔ خلاف معمول آج نور بھی آرام سے سو گئی تھی۔ وہ اس کمرے میں اب چند دن کی مہمان تھی۔ اب کیا دیکھنا باقی تھا زندگی میں.....

”میں مجبور ہوں.....“ جوادی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کب کمرے میں آیا اسے خبر ہی نہ ہوئی یا شاید بہن سے چھپ کر دبے پاؤں کمرے میں آیا تبھی اس کی نگاہ بند



دروازے پر گئی۔ بزدل مرد اپنی ذمے داریوں کا بوجھ عورت کے نازک کندھوں پر ڈال کر سرخ رو ہونے کا طلب گار تھا۔ محبت کا دعوے دار بھی تھا۔ زمانے کے سامنے اعتراف سے بھی ڈرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اس نے اپنا اور نور کا کچھ سامان بیگ میں رکھا اور اسی آنگن میں چلی آئی جہاں اس کی زندگی تھی۔ پانی کے چھڑکاؤ والی سرخ اینٹوں سے بنے پرانی طرز کے صحن سے اٹھتی مسحور کن مہک اور رات بھر رات کی رانی سے مہکتا آنگن.....

”وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں میری بچی کے ساتھ؟“ صفیہ رو دینے کو تھی۔ منظور علی البتہ خاموش تھے۔ گل سے کیا کہتے کہ گھر بسا نا نہیں آیا یا لوگوں نے بسنے نہیں دیا۔ تینوں کی زندگیوں میں نور کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور آنے والی نئی جان نے روح سی بھر دی تھی۔ شعبان امیر الدین کے لگائے الزامات اسی کے منہ پر طمانچہ بن کر پڑ رہے تھے۔ وہ الزامات جو وہ رضیہ کے منہ سے شراروں کی مانند ان سبھی کو جھلسائے دیتے تھے، اب ماں جیسے عظیم مرتبے پر فائز ہوتی گل کی جھلسی روح پر ٹھنڈی میٹھی پھوار ثابت ہو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

وقت کا پہیہ پھر سے تیزی دکھاتے ہوئے چلنا شروع ہو گیا۔ ابراہیم کی پیدائش پر جواد تو نہ آیا عثمان بھانجے کی آمد کا سن کر فروا کو لیے چلا آیا۔ فروا نے نئے مہمان کے لیے عثمان کا کریڈٹ کارڈ خوب ہی رگڑا۔ سامان سے لدے پھندے وہ اگلی ہی صبح آن پہنچے تھے۔

”اتنا سب کیوں لے آئے؟“ گل نے عثمان کے کان کھینچے تو اس نے فروا کی جانب اشارہ کر دیا تو ”اس نے معافی دے دو آپا!“ کہتے ہوئے کان پکڑے تو سبھی ہنس پڑے۔ بچے باپ کی بے توجہی

سہمہ رہے تھے، اس کا احساس سب کو تھا لیکن کیا کرتے۔ عثمان وہاں مٹھائی اور ساتھ لائے تحائف دینے اور ان سب کو رات کے کھانے کی دعوت دینے بھی گیا لیکن فریدہ نے سنگ دلی سے آنے سے انکار کر دیا۔ مٹھائی اور تحائف بھی واپس کر دیے۔ ’میرے جواد کا بچہ نہیں‘ کہہ کر اسے باہر کا رستہ دکھا دیا۔ اس کی آپا کے نصیب میں اور کیا لکھا تھا؟ کتنی پریشانیاں اور جھیلنا باقی تھیں؟ اسے معلوم ہوتا تو اپنا سبھی کچھ دے کر گل کے نصیب میں خوشیاں بھر دیتا۔

☆.....☆.....☆

گھر میں اس نے کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا۔ سوائے پریشان ہونے کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ ”یہ آنگن ہمارے بعد یونہی آباد رکھنا!“ منظور علی نے عثمان کو رخصت کرتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئی۔

”ابا کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!“ تڑپ کر بولا اور باپ کے گلے لگ گیا۔

☆.....☆.....☆

”سنو! میرے کمرے میں آنا ہو تو دستک دے کر آیا کرو“ ثمرہ نے ’میرے کمرے پر زور دیتے ہوئے رانیہ کو وارن کیا۔ وہ بے دھڑک دروازہ کھول کر آ گئی تھی۔

”نند بھابھی میں کیا گفت و شنید جاری ہے؟“ جواد واش روم سے گیلے بالوں میں تولیہ چلاتا باہر نکلا تو ثمرہ کو سرگوشی میں بہن سے باتیں کرتا پا کر خوش دلی سے بولا۔

”کچھ بھی تو نہیں میں تو آپ کی چھوٹی بہن کو زندگی گزارنے کے گر سکھا رہی تھی۔ کیوں رانیہ!“ لہجے میں مٹھاس بھرے اس نے ہونا کھڑی رانیہ کو مخاطب کیا جو نئی نویلی بھابھی کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے پر حیران تھی۔

”یہ بھی سدرہ کی طرح فلا سفر نکلی۔ فرق یہ ہے کہ وہ کہتی نہ تھی اور یہ کہنا جانتی ہے۔“ نئی بیوی

کو اپنا موازنہ پرانی بیوی کرنا اُسے برا تو بہت لگا لیکن چہرے پر منافقت کی مسکراہٹ سجائے رہی۔

☆.....☆.....☆

اس روز کی تنبیہ کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھی۔ بھائی کے کمرے میں جانا تو دور پاس پھٹکنا بھی چھوڑ دیا تھا کہاں پہلے بے دھڑک کمرے میں گھس جانا اور کہاں یہ حال..... اُس کے نام نہاد ڈپریشن کا علاج ہو گیا تھا۔ ”سدرہ بھا بھی تو ایسی نہ تھیں۔“ ماں سے کہنے میں دیر نہ کی۔ اسے غصہ بھائی کے دور ہونے پر تھا۔

☆.....☆.....☆

”میں کیا کہہ سکتا ہوں امی! آپ ہی کی بھتیجی ہے۔ جینا حرام کر رکھا ہے۔ آفس کے کاموں سے تھکے ہارے آؤ تو گھر پر بیوی کا ڈپریشن جھیلو۔ دن رات کی تخصیص کے بنا۔ عجیب عورت ہے کہتی ہے آج بھی اسی کی یاد میں آہیں بھرتا ہوں۔ میں بھلا کہاں اس کے قابل..... بزدل مرد ہوں جو گھر میں رشتوں میں تناسب نہیں رکھ پاتا.....“ بیٹا آفس سے گھر آیا تو بھو گھر میں نہ تھی اتفاق ہی تھا ورنہ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو ایک پل کو اپنے مجازی خدا سے غافل نہ ہوں۔

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ پیٹ بھرنے کو دو وقت کی روٹی ہی مل جائے تو غنیمت ہے کہاں ہم..... کہاں وہ.....“ ماں نے ہاتھ پہلے نیچے پھراؤ پر کر کے موازنہ کیا۔

”باجی آرہی ہیں۔ ان کی بہو انھیں رکھنے پر تیار نہیں۔ بھائی کا گھر ہی ان کا میکہ ہے پر یہاں تو اس کی اجارہ داری ہے۔ کیا کروں سمجھ نہیں آرہا کیسے ہوگا سب؟ کاش تمہارے ابا زندہ ہوتے تو بہن کو کہیں جانے نہ دیتے۔“

”اماں آپ ادھر کیوں نہیں ہو آتیں؟ وہ ضرور کوئی حل نکال لے گی۔“ بیٹے نے ماں کی الجھن کا سراپکڑا اور سلجھن پیش کی۔

”وہ مجھے معاف تو کر دے گی نا! میں نے کیا کیا نہیں کیا؟ اسے بتا دوں؟“



”امی! وہ سب جانتی ہے اور بھول کر آگے بڑھ گئی ہے۔ بہت ظرف والی ہے۔“ بیٹے نے کہا اور آنکھوں میں آنی نمی ماں سے پوشیدہ رکھنے کو اٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

آٹو میں بیٹھتے سے اسے بہت سے خدشات نے گھیرے رکھا تھا۔ ”میں نے بہت برا کیا میری بچی! بیٹی نہیں میری اسی لیے دل اتنا سخت ہو گیا تھا۔“

☆.....☆.....☆

جواد مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ آیا تو صحن میں ٹرائی سائیکل چلاتی نور نے ایک پل کو رک کر اس اجنبی کو دیکھا اور پھر سے گول گول اپنی سواری گھمانے لگی۔ صحن میں جھولے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ صفیہ نے نیل کی آواز پر دروازہ کھولا تو ابراہیم گود میں تھا۔

”وہ..... میں..... بیٹا ہونے کی خوشی میں مٹھائی دینے آیا تھا۔“ ماں کا دیا جوش جھاگ بن کر بیٹھا تو خفت نے آلیا۔

”ہم تمھاری طرح کم ظرف نہیں..... خوشیوں میں شریک ہونے والے لوگ ہیں بیٹا خوش رہو جہاں بھی رہو!“ صفیہ نے ڈبہ ہاتھ سے لیا اور اندر چلی گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔ اسی پل سدرہ بھی آگئی۔ قریبی اسکول میں جاب کر کے اپنی ڈگریوں کو زنگ آلود ہونے سے بچانے کی تگ و دو میں تھی۔ تجربہ حاصل کر کے اس کا ارادہ گورنمنٹ اسکول میں اپلائی کرنے کا تھا۔ سرسری نگاہ اس مجبور مرد پر کی اور اندر چلی گئی۔ صفیہ جتنی دیر میں باہر آئی وہ جاچکا تھا۔ قریب تھا کہ نور اپنی سواری چلاتی کھلے دروازے سے باہر نکل پڑتی؛ بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

”بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ مٹھائی لے کر آیا تھا۔ مجھے اچھا نہ لگا جتا کر کم ظرفی دکھاتی۔“ سلیب پر رکھے ڈبے کی طرف اشارہ کرتی صفیہ نے وضاحت دی تو جواب میں اس نے بس یہی کہا: ”پہلے بیٹے کی

مٹھائی تو واپس کر دی تھی اب کس بات کی خوشی!“ صفیہ کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔  
 ”ابراہیم کو دیکھ کر آتی ہوں۔“ کہہ کر فرار کی راہ لی۔ اکلوتی بیٹی ہلکان ہو رہی تھی وہ کیسے قرار پاتی؟

☆.....☆.....☆

جواد اس کے بعد وہاں پھر نہیں گیا۔ کس منہ سے جاتا؟  
 ”ایک سے زائد بیویاں رکھنے کا حق صرف اسی کو جو عدل سے کام لے۔“ کبھی کا پڑھا اس سبق کی مانند یاد آتا جو رات کو اتنا رٹا جاتا کہ صبح یاد کی سلیٹ سے کورا ہو جاتا اور امتحان گاہ میں لاکھ کوشش پر بھی یاد آ کر ہی نہیں دیتا.....

☆.....☆.....☆

”میں چاہتا ہوں کہ ہم تینوں مل کر ایک ایسا دارال سکون بنائیں جو زمانے بھر کی ٹھکرائی خواتین اور بے سہارا بچوں کی پناہ گاہ ہو۔“ مصروفیت بھرے دنوں میں عثمان کے میسج نے اسے سوچ کی نئی جہت عطا کی۔ اس سوچ کو عملی جامہ پہناتے، لیکن اس سے بھی پہلے اسے جواد سے ملنے جانا تھا۔ ہر صورت نباہ کرنے والی عورت کو اب بیٹی کے اسکول میں داخلے کے لیے باپ کی جانب سے ثبوت کی شرط عائد کی گئی تھی۔ اس سٹوفلیٹ کے بنا نور کا داخلہ کسی بھی اسکول میں ممکن نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

”یہ یہاں کیوں آئی ہے؟“ اس کی دوسری بیوی اور اس کے دوسرے بیٹے کی ماں اب اپنا حق جتا رہی تھی۔ کمرے سے باہر ان کے جھگڑے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”بچوں کا ب فارم بنوانا ہے اسی لیے وہ یہاں آئی ہے۔“ جواد نے لہجے کو ممکن حد تک دھیمار کھا۔  
 ”میں کچھ نہیں جانتی۔ اس گھر میں یا وہ رہے گی یا میں!“ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اس کا دل تو کیا کہ ابھی اٹھ کر چلی جائے۔ کبھی نہ آنے کے لیے..... لیکن اولاد کی خاطر یہ ذلت بھی سہنا تھی۔

”جب تم نے اسے طلاق دے دی ہے تو یہاں کیا کر رہی ہے؟“ وہ حلق کے بل چلائی

”میں نے اسے طلاق نہیں دی، غلط بیانی مت کرو!“ جواد کی آواز اس بار قدرے بلند تھی۔

”کیوں میرے گھر کا سکون برباد کرنے آئی ہو؟“ فریدہ نے ڈرائنگ روم میں بیٹھی سدرہ

پر آنکھیں نکالیں۔

”تو صحیح بیانی تم کر دو! کہہ دو تم آج بھی اس کے عشق میں پاگل ہو!“ جواد اس کے پاس تھا پھر

بھی اسے خدشات گھیرے رکھتے تھے۔

”کاش کہ میں اسی کے عشق میں پاگل رہتا“ جواد کو گئے دنوں کا ملال تھا شاید یا حال کی بے حالی

کا نوحہ.....

”باہر پھرتی ہو اور یہ بھی نہیں جانتی کہ ب فارم کہاں سے بنتا ہے؟ کیسے بنتا ہے؟ ابھی کے ابھی

یہاں سے چلتی نظر آؤ جواد کو تم سے ذرا بھی دلچسپی نہیں بل کہ تمہیں ہی جواد کو اپنے قریب کرنا نہ

آیا“ کمرے سے باہر اتے ہی ثمرہ اس پر چڑھ دوڑی۔ الفاظ تھے گویا کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا

گیا ہو۔ جواد نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے دیکھا اور میز پر مطلوبہ کاغذات رکھ دیے۔

☆.....☆.....☆

نور کا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ اس نے عثمان سے اس سب کا ذکر نہ کیا۔ کیا کہتی کہ ذلیل کر کے نکالا گیا

ہے۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے وہ وقت پر سب بے باق بھی کیے دیتا ہے سمجھ بھی وقت پر ہی آتا ہے۔ ابراہیم

صفیہ کے پاس رہتا اور دونوں ماں بیٹی اسکول چلے جاتے۔ دونوں بھائی البتہ اس سب سے غافل نہ تھے۔

”عاطف کے آنے پر سارے معاملات مل کر طے کریں گے۔ ان شاء اللہ!“ ہر بار چھوٹے بھائی

سے بات کرنے کے بعد وہ خود کو یاد دہانی کروانا نہ بھولتا۔

☆.....☆.....☆



عثمان کی بھاگ دوڑ جلد رنگ لے آئی اور صفیہ اور منظور علی کے ہاتھوں سے 'آشیانہ مسکن' کا افتتاح بھی ہو گیا۔ مشینوں کی گھر گھر راور بے سہارا ہنرمند خواتین کا ہنر دو آتشہ ہوا تو قابلیت کو پذیرائی ملنے لگی۔ کسی بھی عورت کے لیے سر کی چھت کے چھن جانے سے بڑا خوف شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ چھت ملی تو کام پر دھیان بھی بڑھا۔ ہنر اور قابلیت کو پذیرائی ملی تو لہجوں میں بے فکری بھی در آئی۔ پکی اینٹوں سے بنا ہوا آنگن اب خالی ہونے کو تھا۔ عاطف کو ہاسپٹل گھر سے دور پڑتا تھا پھر آشیانہ مسکن کو بھی وقت دینا ہوتا تھا۔ یہی طے ہوا کہ رہائش تبدیل کر لی جائے۔ پرندے اڑان بھرنے کو تھے۔ ہجرت خلق کی خدمت کی خاطر ہو تو رائیگاں نہیں جاتی۔



آفس میں اس کے خلاف محاذ کھل گیا تھا۔ یوٹیوب پر اس نے لائیو سیشن رکھا تھا مخالف پارٹی پر کیچڑ اچھالنے کو..... مخالف پارٹی نے ہر فورم پر اس کی پارٹی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اس کی پارٹی نے اسی کی بکی دے دی تھی۔ اخبارات میں سوشل میڈیا پر اس سے لاطعلقی کے اشتہارات چلائے گئے۔ سیکورٹی بھی چھنی اور آفس کے مالیاتی شعبے میں غبن کے الزامات بھی سچ ثابت کر دیے گئے..... وہ سچ جو اس نے کبھی کیے ہی نہ تھے اس دروغ گوئی پر بھاری ثابت پڑ گئے جو ماضی میں گل کے لیے ہوئی تھی۔

کال کوٹھڑی میں پہلی رات وہ آئی تھی اسے یاد دلانے  
”اللہ حساب لے گا!“

اس نے چونک کر آس پاس دیکھا وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ سوائے اس بھیا نک تاریکی کے جو اب اس کا مقدر بننے جا رہی تھی.....



”مہک آپ کی کوئی خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔“ ہاجرہ آفس کے گلاس ڈور پر دستک دے کر

اندرا آئی۔

”کون ہیں؟ اس نے پوچھا ساتھ ہی اس کی نگاہ ایل ای ڈی پر گئی۔ آفس کے باہر والا کیمرہ ایک ادھیڑ عمر خاتون کا چہرہ دکھا رہا تھا۔

”مامی جی.....“ اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

☆.....☆.....☆

”مامی جی میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے اب کچھ بھی تو یاد نہیں“ سلیمہ کے جڑے ہاتھ ہاتھوں میں دبائے کہا تو اس کے لہجے کی سچائی کی گواہی آنکھوں نے بھی دی۔ بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر بسیرہ نہیں کرتے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی اپنے نام کی ایک..... سدرہ گل مہک..... رضیہ سیالکوٹ سے لاہور آگئی تھی۔ گل نے خالہ کو لینے گاڑی بھیج دی تھی۔ رضیہ اب کہیں نہیں جائے گی یہ طے تھا۔ اُس نے سب کو کبھی کا معاف کر دیا تھا تو اب سزا کیسی؟

”زبان کا بویا پلکوں سے کاٹنا پڑے تو یونہی جان جایا کرتی ہے پر کاٹنا تو ہوگا۔ ثمرہ میری ہی طرح کڑوی ہے۔ میں دل میں بغض رکھتی تھی وہ زبان سے اگلتی ہے۔ دلاور کے جانے کے بعد تو اس کی زبان میں اور بھی کڑواہٹ بھر گئی ہے۔“

”میں جانتی ہوں مامی جی! آپ کی جگہ میں ہوتی تو شاید اس سے بڑھ کر کرتی۔ جو ہوا سے بھول جائے۔ خالہ ہمارے آبائی مکان میں رہیں گی۔“ گل نے آبائی مکان کی چابیاں سلیمہ کے ہاتھ پر رکھیں۔

”نعمان ٹھیک کہتا ہے تم بہت بڑے ظرف والی ہو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

☆.....☆.....☆

کرپشن ثابت ہو گئی تھی۔ مخالف پارٹی کے کارکنوں نے گھر پر پتھراؤ کیا تو ملکہ کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کا رضیہ سے جھگڑا ہوا تھا۔ اسی پریشانی میں رضیہ نے سلیمہ سے دل ہلکا کرنا چاہا جو عالیہ کو اپنی غیبت

لگا۔ نعمان کے کہنے پر سلیمہ گل کے پاس چلی آئی۔ گل نے اماں ابا اور دونوں بھائیوں سے بات کر کے رضیہ کو کہیں نہ جانے دینا طے کر لیا تھا۔ عاطف کی پوسٹنگ بھی اسلام آباد میں ہو گئی تھی۔ وہ صفیہ اور منظور علی کو لے کر وہیں آ گیا تھا جہاں اس کے بچپن کی شرارتوں کا ساتھی عثمان رہ رہا تھا۔ گل 'آشیانہ مسکن' میں بری طرح مصروف ہو گئی تھی۔ مہینے کا ایک دن سب ایک ساتھ گزارتے تھے۔ زندگی کا یہ مصروفیت والا چہرہ گل کی زندگی میں ڈھیروں سکون کا باعث ثابت ہوا تھا۔ جواد نے ان سے پھر کبھی رابطہ نہیں کیا۔ ثمرہ اس کی پل پل کی نگرانی جو کرتی تھی۔ کہیں پہلی بیوی اور بچوں کی محبت بے دار نہ ہو جائے۔

☆.....☆.....☆

کچرا پھینکنے والا اور پھولوں کی ٹوکری دینے والا دونوں ہی اپنے اپنے ظرف کی پستی اور بلندی دکھاتے ہیں۔ رضیہ نے بھانجی کے ساتھ جو کیا وہ اس کے ظرف کی پستی تھی۔ اب گل نے جو کیا وہ اس کے ظرف کی بلندی اور اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ سب بھول کر آگے بڑھ گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

”کہاں ہیں تیرے وہ لاکھوں اندھے پیروکار؟ تیرے کہے میں عمل کی تاثیر ہوتی تو وہ تیرے لیے آواز بلند کرتے۔ شعبان امیر الدین تجھے اس مظلوم پر جبر کرنے کی سزا مل رہی ہے۔“ ملکہ اس سے ملنے آئینہ دکھانے آئی تھی کہہ کر رکی نہیں وہ پیچھے چلاتا رہ گیا ”میں نے کچھ نہیں کیا“

”اللہ جانتا ہے تو نے کس کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ زیر لب بڑبڑاتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

آگے کی گلیاں تنگ تھیں۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور رضیہ کا سفری بیگ باہر نکالا۔ ”بی بی جی! یہاں سے گاڑی اندر نہیں جاسکتی۔“ مؤدب انداز میں دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ جواب میں وہ کچھ نہ بولی اور گاڑی سے باہر نکل آئی۔ کبھی اس کے بیٹے نے بھی اسے ایسی شاندار



گاڑی میں نہ بٹھایا تھا۔ صفیہ نے اپنے بچوں کی بہترین تربیت کی تھی۔ رشتوں کو جوڑے رکھنا سکھایا تھا۔ ”مہک بی بی نے سامان لانے کا کہا تھا۔ میں وہ لے آؤں۔ آپ اندر چل کر بیٹھیں۔“ لوہے کے دروازے پر لگاتا لاکھولتے ہوئے اس نے رضیہ سے کہا تو اب یہ طے تھا کہ سرخ اینٹوں سے بنے اس پرانی طرز کے مکان کو رضیہ نے آباد رکھنا تھا سانسوں کی ڈور ٹوٹنے تک.....



خوشبو کا کام پھیلنا ہے سواپنے وقت پر پھولوں کی قبا چاک ہوئی اور سفر کا آغاز ہوا۔ یہی مہک تب بھی پھیلی تھی جب رضیہ گل کی طلب گار بنی جھولی پھیلائے بہن کے پاس آئی تھی۔ موتیے کی مہک تب بھی وہی تھی جب رضیہ گل کی کردار کشی کر رہی تھی۔ یہی مہک اب بھی ہے جب وہ صحن کے بیچ کھڑی وقت کی اکھاڑ پچھاڑ پر انگشت بندھاں تھی۔ وہی گل جو کبھی کم حیثیت تھی، بے مایاں تھی۔ اپنوں کے رحم کی طالب..... رضیہ نے کیا کیا اس کے ساتھ اور بدلے میں گل نے کیا کیا اس کے ساتھ بہن بہنوئی کو کیا منہ دکھائے گی۔ اپنی تقدیر کی سیاہی بھانجی کو ورثے میں دیتی کیوں خود غرض ہو گئی تھی؟

”میں نے سہا تھا لیکن گل کے ساتھ نہ ہونے دیتی..... اللہ کیا مجھے معافی ملے گی؟“ دل اس کی فریاد پر خاموش رہا کہ وہاں ابھی خوشبو اور یقین کا ملاپ نہیں ہوا تھا یقین کے سفر کا آغاز کیوں کر ہوتا.....



کہتے ہیں برا وقت دیکھ کر سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وہی پشت پناہ شعبان سے کنارہ کر گئے تھے جن پر اسے بہت مان تھا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کب اسے نیچا دکھانے کو کس نے کس سے جوڑ بنایا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے وہ اپنے بال نوچتا چیختا چلاتا رہتا۔ وہاں کوئی نہ تھا جو اسے سنتا اس کے دیے گئے بے عمل واعظ پر سر دھنتا..... فریاد کی بازگشت بے مراد ہوئی، اسی کے پاس لوٹ آتی۔



رات کے اس پہر وہ دونوں صحن میں کچھی چار پائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔

”مجھے اُس کا علاج کروانا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا شادی کروں گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

مرض کی تشخیص ہی غلط تھی تو شفا کیسے ملتی؟ کتنی خود غرض ہو گئی تھی نا میں! امیر الدین کا ہاتھ اٹھتا اور میری زبان چلتی تھی۔ کاش کہ میں نے بچوں کی تربیت پر وقت لگایا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنے کو ملتا۔ میرے دونوں بچے

یہی سوچ لے کر بڑے ہوئے کہ عورت اسی سلوک کی مستحق ہے۔ ثانیہ بھی وہی سب سہہ رہی ہے جو مجھ پر بتی اور شعبان نے عورت کے ہر روپ کو پیروں میں رگیدا۔“ رضیہ کے لہجے میں پچھتاووں کا رنگ نمایاں تھا۔

”جانتی ہیں خالہ! یہ زندگی کوئی فلم یا ڈرامہ نہیں جس کا جو سین پسند نہ آئے فارورڈ کیا اور مرضی کا

سین دیکھنے لگ گئے۔ اس کا ہر رنگ دیکھنا پڑتا ہے۔ ہر موسم جھیلنا پڑتا ہے اچھا لگے یا نہیں..... کہ اس

کے سوا ہمارے پاس اور کوئی آپشن ہی نہیں ہوتی۔ خالق ہمیں سرد و گرم سے گزار کر اپنی مرضی کے سانچے

میں ڈھال دینا چاہتا ہے۔ ہم بندے کون ہوتے ہیں پھر اس کی پلاننگ میں رخنہ ڈالنے والے۔ یہ زندگی

کوئی کہانی بھی تو نہیں نا! کہ برا کرتے رہو اور اختتام پر معافی مانگ کر بری الذمہ ہوا جائے جس نے جو

بھی کہا ہے اُسے سہنا بھی تو ہوگا۔“ گالوں پر بہتے آنسو نرمی سے پونچھتے ہوئے اس نے وہ سب کہا جو کبھی

اس پر بیٹا۔ بچے اندر سو گئے تھے۔ رات کی رانی کی مہک میں بے آنگن میں بہت سے اعترافات کیے

جارہے تھے۔ رضیہ کی اس گھر میں پہلی رات تھی۔ پہلی رات چاہے کہیں کی بھی ہو جھیلنا سہل نہیں ہوتا پھر

چاہے وہ رات قبر کی ہو یا جبر کی..... رضیہ کے لیے اس گھر میں پہلی رات جبر کی ہی تھی۔ گل رات بتانے

بچوں کو لیے یہاں چلی آئی بنا کوئی احسان جتائے۔ رضیہ بے آواز روتی رہی۔ رونا ہی تھا اولاد کے کرموں

کو اب رونا ہی تھا۔ بہن بہنوئی کو کیا منہ دکھائے گی؟ کس کروفر سے یہاں سے گئی تھی اور اب کہیں پناہ ملی

بھی تو کہاں..... جو اماں ملی تو کہاں ملی۔





”میری بات کروادو! ایک بار میری بات کروادو! میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔ الزام ہے سب مجھ پر میں شعبان امیر الدین کیسے اس بد بودار کو ٹھڑی میں رہے گا..... میرے ساتھ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے!“ سلاخوں کے پیچھے وہ چنخترہ جاتا اور ڈیوٹی پر مامور اہل کار ”پاگل ہے“ کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ دنوں میں اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ زبان کی شعلہ بیانی ہی اس کا سنگین جرم ٹھہرا تھا۔ کانٹوں کی فصل بو کر پھولوں کا انتظار عبث ہے کہ جو بویا ہے وہی کاٹنا بھی ہوگا.....

☆.....☆.....☆

دھیرے دھیرے رضیہ کا دل اس پرانی طرز کے بنے درود یوار میں لگنے لگا تھا۔ اب پہلے والی سی وحشت نہیں ہوتی تھی۔ گل نے زرینہ بی کو رضیہ کے پاس بھیج دیا تھا تنہائی کا بوجھل بانٹ کر ڈھویا جائے تو سہل ہو جاتا ہے۔ زرینہ بی زمان خان کی بہن تھیں۔ دونوں گل کے پاس ملازمت کے لیے آئے تھے۔ سیلاب کی تباہی کاریوں میں بس یہ دو ہی بہن بھائی بچے تھے۔ زندگی تھی سو جینا تو تھا ہی، لاہور چلے آئے۔ یہاں ان کے چچا زاد بھائی کسی بنگلے میں ڈرائیور تھے۔ اخبار میں ’آشیانہ مسکن‘ کے لیے گارڈ کا اشتہار پڑھا تو قسمت آزمانے آگئے۔ اب یہ طے ہوا تھا کہ زرینہ بی رضیہ کے ساتھ رہیں گی۔

☆.....☆.....☆

## سات سال بعد

اس نے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہوئے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہاتھ کا چھجا بنا کر آگ برساتے سورج کو دیکھنا چاہا۔ ناکامی پر ہاتھ کے ساتھ ساتھ نظریں بھی نیچے کرنا پڑیں۔ گئے برسوں نے اس کا سارا دم خم چھین لیا تھا۔ کوئی بھی تو اسے لینے نہ آیا تھا۔ آتا بھی کون؟ اس کا تھا ہی کون؟ جو تھے اپنے ہاتھ سے گنوا دیے۔ پلاسٹک کی چپل گھسیٹا آگے ہی آگے چلتا رہا کہ کبھی نہ کبھی تو پہنچ ہی جائے گا۔ کہیں



ٹھوکر لگی تو کہیں دم لینے کو فٹ پاتھ پر بیٹھنا پڑا۔ سفر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ انسان بڑا نادان ہے چاہتا ہے صعوبتوں کا سفر بھی خوشی کی ساعتوں کی طرح جلد بیت جائے.....

☆.....☆.....☆

رات گہری ہو چلی تھی۔ پردوں کی دبیز تہہ ایک طرف کیے وہ گلاس ونڈو سے باہر دیکھتے پورے چاند کا جو بن دیکھ رہی تھی۔ لان تو چاندنی میں نہایا ہوا ہی تھا کمرے میں بھی اس کی آمد پر قدغن نہ تھی کہ چاندنی پھیلنے کو ذرا سی درز کی ہی تو محتاج ہوتی ہے اور وہ تو اسے دل و جان سے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔  
”آپ ابھی سوئی نہیں!“ سارہ نور نے ماں کے کندھوں کو نرمی سے چھوا۔ ماں کے برابر تو آہی گئی تھی۔ گل نے مڑ کر دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا ہی ہے آپ کا شہزادہ کافی کا دیوانہ پھر سے دو کپ بنا بیٹھا ہے۔“ ہنس کر کہا۔ گل بھی ہنس پڑی جانتی تھی عمر ابراہیم کبھی اکیلے کافی نہیں پیتا۔ اسی پل دروازہ کھولے وہ ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ بہن کے قد کو مات دیتا لڑکپن کی دہلیز کو چھوتا اسے اپنے بھائیوں کا ہی عکس لگا۔

”شکر ہے دو کپ بن گئے۔“ ہر بار وہ یہی کہتا تھا اور ہر بار ماں ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ایک کپ اٹھا لیتی۔ سارہ جتنا کافی سے دور بھاگتی عمر اتنا ہی کافی کا دیوانہ تھا۔  
”اتنی کافی کیوں پیتے ہو؟“ ماں نے ہمیشہ کی طرح گھر کا۔

”آپ کا ساتھ دینے کو.....“ سپ لیتے یاد دلانا نہ بھولا اسے گل سے ہی کافی پینے کی عادت ملی تھی۔ عثمان بھی ایسے ہی اس کا ساتھ دیتا تھا جب ابا سٹور سے گھر کا سامان لاتے بیٹی کے لیے کافی کی بوتل لانا نہ بھولتے۔

”اکیلے کیسے پیو گی؟“ عثمان ہنس کر کہتا اور گل ایک نہیں دو کپ بنایا کرتی تھی۔ ماضی کے وہ جگ راتے یاد کرتے سب لبوں پر دھیمی مسکان پھیل گئی جسے دیکھ کر بہن نے ہونٹوں کو عثمان ماموں کہنے کے

انداز میں گول کیا جس کی تائید عمر نے بھی کی۔ بچے بھی ماں کے مزاج کے ہر موسم سے واقف تھے۔ اس پل باہر لان میں پھیلی چاندنی کا رنگ کچھ اور بھی سنہرا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ نیل دینے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چکر آنے سے وہیں گر گیا۔ منزل پر آیا تھا یا ابھی راہ میں ہی تھا اُسے بھی خبر نہ ہوئی کب ہوش سے بے گانہ ہوا.....

☆.....☆.....☆

”ان کے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہو گیا ہے۔ بہتر ہے کہ گھر پر علاج کی بجائے انہیں ہسپتال لے جایا جائے جہاں ان کی بہتر دیکھ بھال ہو۔“ ڈاکٹر نے جاتے جاتے تاکید کی اور ملکہ نے گھر کے سٹور روم میں اس کی چار پائی کی جگہ بنا دی جہاں لگا چھت کا پنکھا کچھ ایسے چلتا کہ پرگنا مشکل نہ لگتا اور چار پائی پر پڑا لاچار وجود یہی تو کرتا تھا.....

☆.....☆.....☆

”تمہارے بھائی کی خدمت مجھ پر فرض نہیں۔ شکر کرو گھر کے دروازے اس پر بند نہیں کیے۔“ ملکہ نے نند کو اطلاع دی تو بہن سے رہا نہ گیا۔ دن کا ایک وقت اب اس کے لیے مختص کر دیا تھا جو کبھی ظلم ڈھاتے چوکتا نہ تھا آج لاچاری کے سبب اپنا بوجھ اٹھانے سے بھی قاصر تھا۔ جنہیں کبھی حقیر جانا تھا آج انھی میں سے ایک اس کی غلاظت صاف کر رہی تھی۔ وہ جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا تھا آج بدن کے رستے ناسور پر جگہ بنانے والی مکھی تک اڑانے سے مجبور تھا۔ جن عورتوں کو حقیر جانا آج انھی میں سے ایک حقیر عورت اُس کے گندگی اٹھا رہی تھی اللہ کی رضا کی خاطر..... اُس کی زبان پر مگر اب بھی ایک ہی بات تھی:

”میں نے کسی کا کیا باگاڑا تھا؟“

☆.....☆.....☆

کمرے کے در و دیوار کی خستہ حالت اس کے مکین کی بے مائیگی کا نوحہ کہہ رہی تھی۔ کمرہ کیا تھا کاٹھ کباڑ سے بھرا سٹور روم تھا جس کے ایک کونے میں پرانا پلنگ اور ٹوٹی ہوئی میز رکھی تھی۔ پلنگ اور اس پر بکھرا وجود گواہی دے رہا تھا کہ وقت کے ہر فرعون کو شکست ہو کر رہی رہتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں بالآخر انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں..... سوائے لوگو! عبرت حاصل کرو۔ لیکن کیا ظالم اپنے عروج میں یہ سب سوچتا ہے؟

”اللہ! میں نے کسی کا کیا بگاڑا!“ کمرے کی سیلن زدہ دیواروں سے ٹیڑھے منہ سے نکلا سمجھ میں نہ آنے والا بین ٹکرا کر اسی کے پاس لوٹ آتا کہ دیواروں نے بھی اس کی فریاد پر کان بند کر لیے تھے..... دائیں ہاتھ سے گھنٹی بجا بجا کر گھر کی واحد مالکن کو پکارتا رہ جاتا۔ جو اپنے نام کے ساتھ ساتھ مزاج کی بھی ملکہ تھی۔ دل کیا تو دل جلانے آن کی آن میں کمرے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے باتیں سنا جاتی۔ موت کی آہٹ پر کان دھرے مجازی خدا کی خدمت اس پر فرض تو نہ تھی۔ ہاں اگر وہ ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن کیا وہ ہوتی یہاں؟ اسے یہاں سے نکل جانے پر اسی نے تو مجبور کیا تھا۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد بھی زندگی کی راہیں مسدود کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کیا وہ رکی؟ نہیں، وہ تو بہت پانی تھا۔ لاکھ بندشیں لگائیں وہ ہر بار نئے سرے سے ہمت جمع کیے کھڑی ہو گئی۔ ”کاش وہ مجھے کہیں مل جائے!“ دل سے اک ہوک سی اٹھی اور سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ وہ جو موت کی آہٹ کا منتظر تھا، خوف زدہ ہو گیا حساب لیے جانے کا خوف..... موت کو گلے لگانا سہل تو نہیں..... یہ توجی داروں کا کام ہے۔



بہن آتی خاموشی سے اس کے وہ کام بھی کرتی جو نہ بھی کرتی تو اس سے باز پرس نہ ہوتی۔ اتنا تو بدلہ لے ہی سکتی تھی جتنا اس نے جھیلا تھا۔ وہ بلاتا رہ جاتا اور ثانیہ خاموشی سے کام پورا کرتی اور چلی جاتی۔ دن کا بقیہ حصہ ملکہ کے طعنے سننے میں بیت جاتا۔

”وہ اب مجبور ہیں کم از کم اس حالت میں تو ان پر رحم کھائیں۔“ ایک روز ثانیہ نے کہہ دیا۔



”رحم ہی تو کھایا ہے۔“ بے رحمی سے گویا ہوئی

”آپ کے ساتھ تو بھائی نے کچھ برا نہیں کیا۔ جس کے ساتھ کیا وہ بدلہ لیتی تو بات اور تھی

بھابھی!“

”اچھا ہی ہے نا! میں نے اسے دہرے عذاب سے بچا لیا؛ نہ ظلم کرتی ہوں نہ خود پر کرنے دیتی

ہوں۔“ سفاکی سے کہا اور گنگنائی ہوئی چلی گئی

ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں

صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

☆.....☆.....☆

”ماما میرے بابا کہاں ہیں؟“ نور اسکول سے واپس آئی تو سیدھا ماں کے پاس آئی اور سوال کیا۔

”تو اب وہ گھڑی بھی آگئی جب ان بچوں کا حقیقت سے شناسا ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ کبھی نہ

کبھی تو یہ سب ہونا ہی تھا۔“

”بتائیے نا! ہم بابا کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ اسکول میں سب اپنے بابا کی بات کرتے ہیں

میں کیوں نہیں کرتی؟“ نور نے پھر سے سوال کیا۔

”آپ اپنے بابا سے ملنا چاہتی ہو؟ یہ بھی جاننا چاہتی ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں

رہتے؟“ گل نے اسی سے سوال کر دیے تو جواب میں نور کا سر اثبات میں ہل گیا۔

☆.....☆.....☆

”تم پھر آگئی؟ بڑی ہی مستقل مزاج عورت ہو۔“ ثمرہ کی زبان کی دھار بھی بڑی ہی مستقل

مزاج تھی۔

”بچوں کو جواد سے ملوانے لائی ہوں۔“ رستہ رو کے کھڑی سوکن کے ایک طرف سے ہو کر سیدھی

اندر چلی گئی۔ پیچھے وہ اپنا سامنہ لیے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جواد ڈرائنگ روم میں بیٹھا چینل سرفنگ کر رہا تھا کہ انھیں اچانک سامنے پا کر بوکھلا گیا۔ اریب اس کے پاس ہی بیٹھا موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔

”نور! ابراہیم! یہ آپ کے بابا ہیں۔“ ماں کے کہنے پر دونوں جھجکتے ہوئے آگے بڑھے۔ خون کی کشش نے جوش مارا اور جواد نے ہانپیں پھیلا دیں۔ اندر آتی ثمرہ کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا۔ حسد اور جلن کی تیز لہر نے اسے سرتاپا لپیٹ میں لے لیا۔

”نہیں ہے یہ تمہارا باپ!“ ایک جھٹکے سے دونوں کو جواد سے علیحدہ کیا۔ اریب نے سر اٹھا کر یہ سب دیکھا اور گیم کھیلنے میں مگن ہو گیا

”ہم ساتھ رہتے ہیں یا نہیں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ میرے بچوں کا باپ ہے اور رہے گا۔ سنا تم نے!“ گل کے لہجے میں قطعیت تھی۔ بچوں کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ جواد پیچھے تک آیا۔ لیکن اُسے دیر ہو گئی تھی وہ مڑ کر دیکھے بنا گیٹ پار کر گئے تھے۔ پھول بوٹوں سے مہکتے آئیڈیل لوکیشن والے اس گھر کے مکینوں کے دل اُن پر ہمیشہ تنگ ہی رہے تھے تو مڑ کر نہ دیکھنا ہی بھلا.....

☆.....☆.....☆

”مما سوری! مجھے نہیں معلوم تھا۔“ نور انگلیاں چٹختے ہوئے معذرتی انداز میں بولی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آنٹی ایسے بی ہو کریں گی۔“

”ماما ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ بس ہم آپ کے ساتھ ہی رہیں گے۔“ سدا کا جذباتی ابراہیم رو دینے کو تھا۔ ماں نے بڑھ کر دونوں کو ساتھ لگا لیا۔ ان دونوں کے لیے سب جان لینا بہت ضروری ہو گیا تھا کہ سب کو بھی کچھ نہیں ملتا۔ زندگی میں کچھ کمیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

بے تاثر چہرہ لیے وہ فریدہ کو سنتی رہی۔ وہ عورت جو کبھی اپنے بیٹے کا کاہلی کو ایک عورت کی خود انحصاری کے پردے میں پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی آج بچوں کے مستقبل کے خوف ناک نقشے کھینچ کر دکھا رہی ہے۔ واہ رے تقدیر تیرے کرشمے! وقت کی سختی بھی نیت کا کھوٹ نہیں دھوپائی تھی۔

”میری بات پر غور ضرور کرنا۔ جو ادب بڑا اثر مندہ ہے۔ کہتا ہے ہاتھ جوڑوں گا سدرہ کے پیر پکڑ کر معافی مانگوں گا جو کہے گی کروں گا دیکھنا معاف کر دے گی اور کیوں نہیں کرے گی مجازی خدا ہوں میں اس کا! کل کلاں نور کی شادی کرنی ہوگی لوگ طرح طرح کے سوال کریں گے کہ باپ ساتھ کیوں نہیں رہتا؟“ لہجے سے ٹپکتا شہد اور حق جتانے والا وہی انداز سدرہ نے اس سب کے جواب میں صرف اتنا کہا: ”معاف کر دیا ہے اور چھوڑ بھی دیا ہے۔ اب اس کی مرضی مجھے اس دنیا دکھاوے کے بندھن میں باندھ کر رکھے یا نہیں، میرے گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں“ دو ٹوک انداز میں ’میرے گھر پر زور دے کر کہا لمحہ بھر کو تو فریدہ چپ رہ گئی۔ لیکن جاتے جاتے گلے شکوے دور کر کے سب بھلا دینے کا کہنے سے خود کو روک نہ پائی۔ وہ صبح کے لیے لیکچر تیار کر رہی تھی، ذہنی طور پر منتشر ہو گئی۔ گھر سے نکال دیے جانے پر بھی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ کیوں نکلتے ہو؟ بھول جاؤ سب! میاں بیوی میں یہی سب ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے یہی سب۔ ایک فریق پس دیتا ہے تو دوسرا یہ سب کیوں نہیں کرتا؟

جو ادب آج بھی اسی روش پر تھا۔ مستقل کوئی جاب نہ کرنے کی پرانی عادت باپ کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب تھے۔ پنشن پر گزارہ کیسے ہوتا؟ کوئی تو سائیڈ آپشن رکھنی تھی ان کے لیے سدرہ گل مہک وہی سائیڈ آپشن تھی.....



”کبھی ذکر نہیں کیا تو کیا میں نہیں جانتا کہ وہاں جانا آپ کے دل میں دبی خواہش ہے۔ بس پھر طے ہو گیا ہم سب عمرہ کرنے جا رہے ہیں۔ اگلے مہینے بچوں کے اسکولوں میں چھٹیاں ہونے والی



ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے یہاں کے سارے معاملات ہاجرہ کے سپرد کر دیں وہ سب سنبھال لے گی۔“ ویک اینڈ پر سب اکٹھے تھے۔ عثمان سب طے کر کے آیا تھا۔ دل میں تڑپ ہو تو اسباب بھی بن جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

سکرین روشن ہوئی تو اس نے فون اٹھا کر دیکھا۔ مطلوبہ میسج تک رسائی کے لیے اسے سپام فولڈر کھولنا پڑا۔ ’آشیانہ مسکن‘ کے سلسلے میں اکثر اسے معلومات دینے کے لیے ان چاہے پیغامات بھی دیکھنا پڑتے تھے۔ شاید کسی کو رہنمائی درکار ہو؟ یہ سوچ کر وہ کوئی بھی پیغام ان دیکھنا نہ چھوڑتی۔

”آپ میری کہانی لکھیں گی نا!“ چھ لفظی مان بھرے استحقاق نے اسے جواب ٹائپ کرنے پر اکسایا۔

”فیک آئی ڈی بھی تو ہو سکتی ہے!“ دماغ نے تاویل گھڑی۔

”فیک ہوئی بھی تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟ بات کر لینے میں حرج ہی کیا ہے؟“ دل نے دماغ سے جرح کی۔

☆.....☆.....☆

”اللہ نے تمہیں نعمت اور رحمت دونوں سے نوازا ہے۔ ان کی بہترین انداز میں تربیت کرو فردیت سے ہی جمعیت جنم لیتی ہے۔‘ آشیانہ مسکن‘ کے دروازے تم پر ہی نہیں بلکہ ہر اس مظلوم پر یونہی کھلے رہیں گے جو ظالم کا ظلم سہنے پر مجبور ہیں۔ تمہارا شکریہ کہ یادوں سے مہکتے اس چھوٹے سے آنگن کو آباد کرنے جا رہی ہو۔“ مہک اسے گلے لگائے، ممنونیت سے گویا ہوئی تو سامعہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

کون کرتا ہے ایسے؟ اتنی عاجزی کے ساتھ تو کبھی نہیں! بچوں کو لیے گاڑی میں اس یقین کے ساتھ بیٹھی کہ اب اسے گھر سے بار بار نکالے جانے کی اذیت جھیلنا نہیں پڑے گی۔ سامعہ کے والدین اُس کے بچپن میں دُنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ چچا نے میٹرک کے بعد شادی کر دی اور فرض سے سبک

دوش ہو گئے۔ رمیز کی اچانک موت کے بعد سسرال والوں نے سامعہ اور اس کے بچوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور بار بار گھر سے نکال دیتے۔ رمیز کی موت کا ذمے دار بھی وہ ان تینوں کو ٹھہراتے۔ اپنے بچوں کے اخراجات خود اٹھاؤ! سسرال یا میکے میں کوئی نہیں تھا جو ان کے سر پر ہاتھ رکھتا اور اپنے گھروں میں خیر و برکت لاتا۔ یہ تو سر پھروں کی سوچ ہوتی ہے۔ ایسے میں اس کی کسی سہیلی نے اسے آشیانہ مسکن کا پتہ دیا۔ اپنی اسی سہیلی کے میسنجر سے اس نے ادارے کی آفیشل آئی ڈی پر ٹیکسٹ کیا تھا۔ سامعہ سے ملنے کے بعد اسے اپنے آبائی گھر کی چابیاں دینے کا فیصلہ اسی کا تھا۔ منظور علی اپنا آنگن آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ پہلے رضیہ وہاں تھی لیکن اب وہ دنیا میں نہیں رہی تھی۔ ثانیہ ماں کی آخری رسومات میں شریک ہونے آگئی تھی۔ بھائی کا گند صاف کرتے کرتے ماں کو بھول ہی گئی تھی..... بہت بدل گئی تھی وہ۔ پہلے والی ثانیہ کی جگہ اب کھنڈر ہی باقی بچا تھا۔

☆.....☆.....☆

”میرا دل چاہتا ہے کہ پائیڈ پائپر کی طرح بانسری بجاؤں جس کی دھن اس دنیا کی ساری مجبور عورتوں اور بچوں کو مسحور کر دے اور باہر نکلنے پر اکسائے؛ وہ سب باہر نکلیں اور میں ان سے آگے چلتی جاؤں دور کسی غار میں لے جاؤں اور غار کا دہانہ کچھ اس طرح سے بند کر دوں کہ باہر سے کوئی دکھ کوئی پریشانی ان تک نہ آنے پائے۔“ سامعہ کے جانے کے بعد وہ تینوں بیٹھے تھے کہ گل نے اپنی اس عجیب خواہش کا اظہار کیا۔

”آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آشیانہ مسکن وہی غار ہے جس میں کچھ کو تو امان ملی ہوئی ہے۔ یہاں انہیں پریشانی ہے تو صرف یہ کہ ان کی بوتیک میں منفرد انداز کے کپڑے تیار ہوں۔ جن کی ڈیمانڈ بھی ہو۔“ سارہ کی آبرو ویشن بہت کمال کی تھی ہمیشہ وہ نکتہ سامنے رکھتی جس پر کسی دوسرے کی نگاہ کم ہی جاتی۔

☆.....☆.....☆

”بڑا ہی ڈھیٹ انسان ہے! شرم سے مر کیوں نہیں جاتا۔“ اس راجدھانی کی ملکہ کو سننے والا وہ واحد غلام تھا..... ملکہ! جس کی زبان کی کاٹ آج بھی روزِ اوّل جیسی تیز تھی۔

کائنات کے چھوٹے سے سیارے پر بسنے والے انسانوں میں سے ایک..... بستر پر پڑا بے بس انسان..... اپنا دورِ عروج زمینی خدا کی حیثیت سے بتانے والا معمولی انسان جو بدن کے رستے ناسور پر بیٹھی مکھی تک اڑانے سے قاصر تھا..... بے بسی کی علامت بنا گھر کے اسٹور روم میں زندگی کی قید میں پڑا اپنا وقت گزار رہا تھا..... موت کی آہٹ ہوتی تو حساب کا خوف حاوی ہو جاتا۔

آخری بار کہا تھا اس نے: ”اللہ حساب لے گا!“ تب اسے خوف کیوں نہ آیا۔

’خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے

کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے‘

دل کی بھڑاس نکال چکتی ملکہ گنگناتی ہوئی چلی گئی تھی۔ جاتے جاتے سدرہ گل مہک کا تازہ شائع ہونے والا آرٹیکل اُس کے منہ پر مار کر جانا نہ بھولی۔ وہ جو ہیرا تھی، قدر کیے جانے کے لائق..... ناقدروں کے بیچ رہی تو اپنا جوہری آپ بنی اور خود کو تراش کر دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ آشیانہ مسکن کی کیئر ٹیکر..... جسے اپنے فالورز بڑھانے کو دکھاوے کے لائیو سیشن نہیں کرنا پڑتے تھے..... کہ اُس کی لگن اور خلوص دکھاوے کا محتاج نہ تھا.....

ملکہ کی آواز شعبان امیر الدین کو صویر اسرائیل کی مانند لگتی تھی لیکن سننے پر مجبور تھا کہ اپنا عہد ظلمت بتاتے، اسے کبھی زوال کی خاموش چاپ سنائی ہی نہ دی تھی۔ کاش کہ وہ سن لیتا تو کانٹوں کی فصل بونے میں مگن نہ رہتا..... وہ فصل جو آج تنہائی کے کرب کے ساتھ کاٹنا بھی کسی عذاب سے کم نہیں..... لیکن کاٹنا تو ہوگا..... ایک آنسو گرا اور تکیے کے میلے کور میں جذب ہو گیا۔



☆.....☆.....☆

ساری تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ جیسے جیسے روانگی کے دن قریب آرہے تھے اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہو رہی تھی۔ کیا کیا نہ سہا تھا اس دل نے تب نہیں رکا؛ تو اب خالق کے در پر حاضری سے دل کی حالت عجیب کیوں ہو رہی تھی؟

”آپا! ایک بات کرنی ہے۔“ عثمان کا ٹیکسٹ آیا۔ ”پہلے تو کبھی تمہید نہ باندھی؛ پھر اب ایسا کیا ہو گیا؟“ ترنت ریپلائے میں سوال کر ڈالا۔ ”دراصل شعبان بھائی بیمار ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا! میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔“

”عثمان میں نے کسی کو بددعا نہیں دی۔“

”میں جانتا ہوں کہ میری آپا کسی کو بددعا نہیں دے سکتیں۔ بس ایک بار پلیران کی آسانی کے لیے تو دعا کر سکتی ہیں نا!“ اور وہ دعا تو کیا کرتی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹ کرا گئی صبح کی راہ دیکھنے لگی۔

”ایک فیصلہ کن گھڑی یہ بھی سہی“

☆.....☆.....☆

ثانیہ گیٹ بند کر کے باہر نکل رہی تھی کہ سفید آئٹو گیٹ کے پاس آ کر رکی۔ کاٹن کے لیمن کلر کے بے شکن لباس میں وہ گل تھی۔ بے اختیار اس نے بھائی کی غلاظت والے بیگ کا ہاتھ کمر کے پیچھے کر لیا۔ اسے اپنا آپ حقیر لگ رہا تھا۔

”مجھے شعبان سے ملنا ہے۔“ لہجے میں بنا کسی لچک کے اس نے ثانیہ کو مخاطب کیا۔ اس نے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور کمر کے پیچھے ہاتھ میں جو تھا اسے نا محسوس انداز میں باہر سائیڈ پر رکھ دیا۔ محل کی ملکہ کو اپنے شوہر کا وجود تو گورا تھا اس کی گندگی نہیں.....

☆.....☆.....☆

ملکہ نے حیرانی سے ثانیہ کے پیچھے آتی بہت خاص مگر عام سی صورت والی کو دیکھا جس پر عمر کی گھڑیاں جیسے ٹھہری گئی ہوں۔

”آؤ گل! گھر کی مالکن کو یک سر نظر انداز کیے اس نے پیچھے دیکھ کر کہا۔  
”یہ یہاں کیوں آئی ہے؟“ خود کلامی کی اور دونوں کے پیچھے چل دی۔

☆.....☆.....☆

”بھائی! دیکھیں تو کون آیا ہے؟“

”ثنانیہ کی نظروں نے اس کمرے کا طواف کیا جہاں وہ لاچار وجود ڈال دیا گیا تھا۔ پورے گھر کا کاٹھ کباڑ ایک طرف کر کے ایک چارپائی کی جگہ بنائی گئی تھی۔ لکڑی کی پرانی سی میز برابر میں رکھی تھی جہاں کچھ رسائل اخبارات سلیقے سے رکھے گئے تھے۔ ثانیہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا  
”ان سب میں تمھاری تحریریں ہیں۔ میں بھائی کو پڑھ کر سناتی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

ثنانیہ کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں پہچان کا عنصر مفقود تھا۔ وقت کا فرعون ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا.....

”شعبان امیر الدین میں سدرہ گل مہک پورے دل سے تمھیں معاف کرتی ہوں۔“ کسی قسم کے رد عمل کا انتظار کیے بنا وہ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ سٹور روم کی دیوار سے کان لگائے ملکہ اسے تیزی سے باہر آتا دیکھ کر گڑبڑا گئی۔

”بھائی بہت تکلیف میں ہیں۔“ ثانیہ نے پیچھے سے کہا۔ گل وہیں رک گئی:  
”جانتی ہوں۔ آپ بھی اپنے بھائی کو معاف کر دیں کہ مجبوروں سے بدلہ کس بات کا؟“ اس نے مڑ کر دیکھے بنا کہا ثانیہ اس کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئی۔ ”میں بھی ظلم ہوتا دیکھ کر خاموش رہی

گل! مجھے معاف کر دو!“

”میں نے سب کو معاف کر کے چھوڑ دیا۔ جس نے بھی جو بھی بویا ہے وہ کاٹنا تو ہوگا پھر چاہے

پھول ہوں یا ببول.....“

”بھائی کو بیڈ سور ہو گیا ہے۔۔۔ وہ اب کسی کو پہچان بھی نہیں پاتے۔ اللہ سے دعا کرو ان کی مشکل آسان ہو۔ اللہ تمھاری دعا ضرور سنے گا وہ دکھی دلوں کے بہت قریب ہوتا ہے۔“ بہن جھولی پھیلائے تھی وہ خاموشی سے وہاں سے چلی آئی یہ بھی نہ کہہ پائی کہ ماں پر بھی تو اسی نے ظلم کیے تھے۔ ان سے معافی کیسے ملے گی؟

☆.....☆.....☆

گاڑی میں بیٹھتے ہی کچھلی ساری زندگی ایک فلم کی ریل کی مانند چلنے لگی۔  
”میں نے صرف حساب کی دعا کی تھی اللہ!“ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔  
اللہ ہدایت بھی اسی کا نصیب کرتا ہے جسے چاہت ہو جو لگن رکھتا ہو بے ہدایتے تو بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ ہم نے کسی کا کیا باگاڑا تھا؟ اللہ توبہ کی توفیق چھین لیتا ہے ڈرو! اس پل سے جب ہدایت کی توفیق چھین لی جائے گی اور انسان خود سے بھی نظریں چرائے کہتا رہے گا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ واپسی بوجھل دل کے ساتھ ہوئی تھی۔

”ہم شام کو آپ کے بابا کی طرف جارہے ہیں۔“ ماں کے حکمیہ انداز پر بچوں نے ایک دوسرے کو اچھنبے سے دیکھا۔ بہت سال پہلے کی تلخ یاد نے حافظے میں کڑواہٹ گھول دی۔

☆.....☆.....☆

ثمرہ نے نیل کی آواز پر دیکھ لیا تھا کہ باہر کون ہے لیکن کھولا نہیں۔ اس گھر کے مکین آج بھی ویسے ہی تنگ دل تھے۔ ”کیا ہوا ماما! اتنی گرمی میں باہر کیا کر رہی ہیں؟“ تیز دھوپ میں گیٹ کے پاس چکر لگاتی



ماں سے سوال پوچھنے کی غلطی کر بیٹھا جواب میں تیز نظروں سے اسے گھور کر دیکھا اور اندر جانے کو کہا۔  
 ”اپنے باپ کو نہ بتانا!“

”اس کی بیوی اور بچے آئے تھے.....“ ابھی ثمرہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اریب بول پڑا:  
 ”آپ نے گیٹ کیوں نہیں کھولا پھر!“

”یہ میرا گھر ہے یہاں جو بھی آئے گا میری مرضی سے آئے گا ایک بار بے عزت کر کے نکالے گئے اب کیا لینے آئے ہیں یہاں؟“

”ماما لیکن“ بیٹے نے کچھ کہنا چاہا لیکن ثمرہ کے چیخنے پر خاموش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

بچوں کے بل جھکی اور سر نیچے کیے بے آواز تہنیتی پر بہانے لگی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ سب ایک دوسرے سے صرف نظر کیے اپنی اپنی گذارشات مالک کے حضور پیش کر رہے تھے۔

”رو کیوں رہے ہو؟ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟ ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا.....“ رات کے اس پہر صحن حرم کے آب دار فرش پر ہاتھ پھیرتے خود کو یقین دلارہی تھی کہ ہاں وہ اس مقدس جگہ پر ہے جہاں کے بلاوے کو گڑ گڑایا جاتا ہے۔ جہاں حاضری کے لیے بڑے، چھوٹے، امیر، غریب کی تخصیص نہیں۔ جس پر کرم ہو وہی حاضری کا شرف پاتا ہے۔

عمر اور سارہ بھی پاس بیٹھ گئے۔ آج انھیں ماں کا دل بہلانے کی خاطر اپنی بے تکی باتوں کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔ رات بھر جاگنا نہیں پڑے گا کہ ماں کو بے سکون دیکھ کر ان کی نیندیں اڑ جایا کرتی تھیں۔ کتنا انتظار تھا انھیں اس مقدس سرزمین پر آنے کا..... یہ وہ ٹھکرائے ہوئے لوگ تھے جنہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے ہونے کی سعی کی اور اللہ کو سعی کرنے والے بے حد پسند ہیں۔ یہ اللہ کے بندے ہی ہوتے ہیں جو رکاوٹیں کھڑی کیے سمجھتے ہیں کہ زندگی روک دی گئی ہے..... وہ زندگی جو

بہتے پانی کی مانند اپنا راستہ آپ ہی آپ بناتی چلی جائے۔

☆.....☆.....☆

دن میں حرم میں رش سے بچنے کے لیے وہ رات بھر وہیں رک کر عبادت کرتے اور فجر کی نماز کی ادائی کے بعد ہوٹل واپس لوٹتے۔ رات میں دن کا سماں پیش کرتے حرم کے صحن میں اس وقت بہت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہاں جا کر کچھ یاد نہیں رہتا اسے تو کچھ بھولا ہی نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک چہرہ سامنے آتا اور وہ سب پھر سے یاد آ جاتا جسے مدت ہوئی یاد کی سلیٹ سے صاف کر دیا تھا۔ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوتی یا گئے دنوں کا ملال کرتی عجیب کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔

”حساب کا ہی تو کہا تھا مالک! اب مجھے خوف کیوں آرہا ہے؟“ دل عجیب واہموں میں گھرا رہنے لگا تھا۔

وساوس ہیں یا کیا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”مالک! پہلے بھی سب آپ پر چھوڑ دیا تھا آج بھی آپ ہی بہترین فیصلہ ساز ہو۔ اپنی رضا پر دلوں کو راضی کر دو۔“ ہاتھ اٹھائے وہ دعا میں مشغول تھی۔ گال پر بہتے آنسوؤں میں اور بھی روانی آ گئی تھی کہ صفیہ نے اس کے کندھے کو نرمی سے چھوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا عجیب وحشت تھی وہاں۔ ماں کا دل لمحہ بھر کو کانپ گیا۔

”اماں ہم بندے بھی عجیب ہیں حساب اس پر چھوڑتے ہیں پھر جب حساب کتاب ہوتا ہے تو بھی ہم ہی خوف زدہ ہوتے ہیں۔“ آنکھوں کی نسبت لہجے میں قرار پا کر کرماں کے دل کو یک گونہ سکون ملا۔

”اللہ طلب رکھنے والوں کو ہی ہدایت دیا کرتا ہے۔“ کم پڑھی لکھی ماں نے آج وہ پہلو دکھایا جس پر اس کی کبھی نگاہ نہ گئی تھی۔ ماں باپ کا اس عمر میں بھی اپنے پیروں پر چل کر اللہ کے گھر کا طواف کرنا، بھائی بھائیوں کا ساتھ، بچوں کی فرماں برداری، اپنی کامیابیاں اور کیا کیا نہ دیکھتی۔ اسے اگر قلیل

سے محروم رکھا گیا تھا تو بدلے میں کثیر بھی تو عطا ہوا تھا۔

”تم اپنے رب کی کون کون سے نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ دل کو قرار ملا اور ساتھ ہی شکر کا کلمہ بھی کہ دلوں کو قرار بھی اسی رب کی عطا ہے وہ جسے چاہے دے جسے چاہے محروم رکھے۔

☆.....☆.....☆

”کس سے ملنا ہے صاحب!“ زمان خان نے گیٹ پر کھڑے ملگجے حلیے والے سے پوچھا تو اس نے چونک کر آس پاس دیکھا

”اوہ! میں یہاں کیسے؟“ زیر لب بڑبڑاہٹ گاڑ نہ سن پایا تو درشتی سے سوال دہرایا۔

”عمر ابراہیم اور سارہ نور..... ہاں عمر اور سارہ..... میرے بچے یہاں رہتے ہیں، ان سے ملنا ہے۔“ کھچڑی بالوں کی سفیدی میں ہاتھ چلاتے اس نے کہا۔

”وہ تو عمرہ کرنے گئے ہیں صاحب! کوئی پیغام ہو تو دے دو! ام بچہ لوگ کو بتا دے گا۔“

”انھیں بتا دینا ان کا باپ جواد سلیم آیا تھا.....“ پلاسٹک کی پرانی سی چپل گھیٹتا وہ اپنا بتا کر مایوسانہ انداز میں واپسی کے راستے پر مڑ گیا۔ زمان خان نے ’دیوانہ ہے کوئی‘ کہنے کے سے انداز میں شانے اچکا دیے۔

”مل کر بھی نہیں گئے.....“ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا جس کا جواب اس کے پاس بھی نہ تھا ہاں گھر میں اپنی دوسری بیوی سے بات کرتا تو وہ دور و زقبل کا کارنامہ فخریہ بتاتی۔ وہ تو گئے تھے دل کی کثافت دور کرنے کو..... ثمرہ نے ہی گیٹ نہ کھولا تھا۔ اسے آج بھی سدرہ گل مہک سے اتنا ہی خوف آتا تھا جتنا کئی سال پہلے..... جب اس کا جواد سے پہلی بار جھگڑا ہوا تھا..... اسے لگا تھا وہ اس گھر میں اس کا مقام مرتبہ چھین لینے کو واپس آئی ہے..... غاصب ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں حق مارنے والے کبھی سکون سے نہیں رہتے..... وہ بھی غاصبانہ قبضہ چھننے کے خوف میں مبتلا ہو گئی تھی..... یہی اس کی سزا تھی جس میں



اسے آخری سانس تک کی قید سہنا تھی۔

☆.....☆.....☆

”وہ لوگ عمرہ کرنے بھی چلے گئے مجھ سے ملے بھی نہیں۔“ جواد بیٹھا افسوس کر رہا تھا کہ بیٹا پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کو نہیں معلوم وہ آئے تھے لیکن ماما نے دروازہ نہیں کھولا۔“  
”لیکن کیوں.....“

”ماما کہتی ہیں یہ میرا گھر ہے یہاں جو بھی آئے گا میری مرضی سے آئے گا۔“ باپ کے کان میں سرگوشی کی

☆.....☆.....☆

”انسان کو اتنی گھٹیا سوچ کا بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ ٹی وی پر چینل بدلتے ایک پل کو اس کا ہاتھ رکا۔  
”تو بیٹے نے ماں کی برائی باپ سے کر ہی دی باپ پر گیا ہے پیٹ کا ہلکا.....“ وہ بنا ڈرے بولی  
”میری بیوی..... اور میرے بچے..... مجھ سے ملنے آئے تھے لیکن تم نے ان پر اس گھر کے دروازے بند کر دیے۔ وہ عمرہ کرنے چلے گئے ہیں۔“ جواد کی آواز اس بار بلند بھی تھی اور تلخ بھی تلخی اپنے حالات کے لیے جس کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ ”میری بیوی میرے بچے پر جس طرح زور دے کر کہا ثمرہ کا خون ہی تو کھول گیا۔ لیکن خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

”کروں گی وہی جو میرا دل چاہے گا۔“ ہٹ دھرمی سے سوچا اور ساری توجہ چینل بدلنے پر لگادی جیسے دنیا میں اس سے زیادہ توجہ طلب اور کوئی کام نہیں۔ بات ترجیحات کی ہی تو ہوتی ہے کبھی جو شخص خود سے دور لگا کرتا تھا انجانے خدشات ڈرائے رکھتے تھے کہ پہلی بیوی اور بچوں کو سر پر مسلط نہ کر دے وہ تو کب کے اپنی جگہ خالی کیے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ ثمرہ جیسے بے یقینی کا شکار لوگ کبھی سکون نہیں پاتے۔

جواد کی دوسری شادی کے کچھ عرصے بعد فریدہ نے رانیہ کی شادی میں دیر نہ کی۔ وہی فریدہ جسے بیٹی کے لیے کوئی موزوں شخص نہیں ملتا تھا اب حالات کے بدلتے رخ دیکھ کر جلد از جلد اس فرض کو پورا کرنا چاہتی تھی۔

ثمرہ نے اپنی حق جتانے والی نیچر سے بہت جلد سب کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ سدرہ کے ساتھ اس گھر میں برا ہوا تھا۔ زبان سے نہ سہی دل میں اس کا اعتراف وہ اور سلیم صاحب بارہا کر چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

گھرباپ کی پنشن سے چلتا تھا کہ جواد کو کام کرنے کی عادت جو نہ تھی۔ ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے فریدہ نے اوپر کا پورشن بنوا کر کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ بھرم ہی سہی؛ رکھنے میں کسی حد تک کامیاب تو ہوئی تھی۔ کس منہ سے اعتراف کرتی کہ ہیرے کی قدر نہ کی۔ جو بھی تھا سہنا تو تھا اب!

☆.....☆.....☆

تم جس خواب میں آنکھیں کھولو اس کا روپ امر  
تم جس رنگ کے کپڑے پہنو، وہ موسم کا رنگ  
تم جس پھول کو ہنس کر دیکھو، کبھی نہ وہ مرجھائے  
تم جس حرف پہ انگلی رکھ دو، وہ روشن ہو جائے

ڈبڈبائی آنکھوں سے امجد اسلام امجد کا کلام پڑھا اور شکر یے کاری پلائی مسکرانے والی ایسوجی کے ساتھ بھیج کر موبائل فون سائیڈ پر رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

پکی اینٹوں والے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیے وہ اب سانسوں میں اس کی مہک اتار رہی تھی جس میں اس گھر کے مکینوں کی سانسیں بٹاش رہتی تھیں۔ کیاری میں لگے انار کے کھلتے پھولوں کی کھٹی میٹھی خوش بو، موتیے کی دلفریب مہک گھر کے اس حصے کو معطر کیے جانے کی تگ و دو میں ہلکان ہوئی جاتی تھی۔ گھر ایک عرصے بعد پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ گوہر اور نایاب کی کھکھلاہٹیں گھر میں زندگی کے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں رات کی رانی کی خوشبو بھی آنگن کا احاطہ کرنے پھولوں کی قید سے رہائی پانے کو تھی کہ خوشبو اور یقین کا ملاپ ہو جائے تو سفر کبھی رکتا نہیں۔

ختم شد